جلتا ہوا کشمیر

ثریا خورشید

انتساب

بھائی ''خالد حسن'' کے نام

ثریا

سری نگر 110 میل: اب بھی مظفر آباد میں دو میل کے پاس جہاں دریا جہلم اور نیلم ملتے ہیں۔ یہ سائن بورڈ نظر آتا ہے۔ عجیب سے احساسات ہوتے ہیں۔ صرف ۱۱۰ میل کا فاصلہ اور یوں لگتا ہے۔ گویا چاند اور سورج کی سی دوری کا فاصلہ حائل ہو۔ بلکہ ایسا فاصلہ جو ناقابل عبور ہے۔ ناقابل پہنچ ہے۔ ناقابل تسخیر ہے۔ تقریباً نصف صدی ہونے کو ہے۔ لیکن کشمیر کی آزادی اتنی ہی دور ہے۔ جتنی پہلے تھی۔ یوں گویا سب کچھ استادہ ہو۔ اور ہم کوشش کے باوجود اس سربفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی خوبصورت وادی کے بدقسمت لوگوں کے لئے کچھ نہ کر سکتے ہوں۔

یوں تو کوہالہ کا پل عبور کر کے آزاد کشمیر کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ کسی بھی محبّ الوطن کشمیری کو جہلم کے بہتے پانی کو دیکھ کر ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پانی کشمیر کے پہاڑوں سے آتا ہے۔ جہاں غیروں کا قبضہ ہے۔ جو وہاں زبردستی قابض ہو گئے ہیں۔ اور جن کو اُن پرامن وادیوں کے رہنے والوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوئی۔ تو ریاستوں کا فیصلہ بھی اُن ہی بنیادوں پر ہوا تھا۔ ۵۸۶ برٹش

انڈیا کی ریاستیں راجے۔ مہاراجوں اور نوابوں کی ملکیتیں تھیں۔ ریاست کشمیر چند اُن بڑی ریاستوں میں شامل ہوتی تھی۔ جو جغرافیائی لحاظ سے نہ صرف اہم تھی۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی متنازعہ تھی۔ کہ اس کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اور حکمران ایک کٹر ہندو ڈوگرہ تھا۔ ۸۴ ہزار مربع میل کی یہ خوبصورت ریاست' جو ہمالیہ کے دامن میں گھری ہوئی ہے۔ جس کی سرحدیں افغانستان، روس، چین اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ کسی طرح بھی بھارت کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ ۸۰ فی صد مسلمان آبادی کے ساتھ اس کا محل وقوع بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کی ایک وجہ تھا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بھارت کی عیاری۔ مہاراجہ کی ناعاقبت اندیشی اور مقامی سیاست کی نااہلیت کی وجہ سے ریاست کے حکمران نے ایک عارضی سمجھوتہ بھارت کے ساتھ کر لیا۔ جو مستقل سمجھوتہ بن گیا۔ اس دوران پونچھ میں مقامی بغاوت ہو گئی۔ جو کچھ سابقہ فوجیوں نے کی۔ مقامی انتظامیہ اس سے نپٹ نہ سکی۔ لڑائی ہوئی۔ اور ریاست کا یہ حصہ ڈوگرہ راجہ کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ اس میں قبائلی پٹھانوں کی مدد بھی شامل تھی۔ جو سری نگر کی طرف بڑھے بارہ مولہ تک پہنچے۔ لیکن سری نگر ایئرپورٹ پر قبضہ نہ کر سکے۔ اس وقت تک بھارت سے کوئی زمینی راستہ کشمیر کو نہیں جاتا تھا۔ یہ تو بعد میں ریڈکلف آوارڈ کے جھوٹے اور عیار فیصلے سے گورداسپور سے بھارت کو کشمیر میں جانے کا راستہ مل گیا۔ ورنہ گورداسپور بھی پاکستان کا حصہ تھا۔

پونچھ میں بغاوت کے طور پر علاقہ آزاد ہوا۔ وہ ''آزاد کشمیر'' کے نام سے مشہور ہوا۔ ۴۲۰۰ مربع میل کا یہ مختصر علاقہ اس وقت بھی ریاست کے آزاد علاقے کی حیثیت سے وہی مقام رکھتا تھا۔ جو پوری ریاست کو حاصل تھا۔ گلگت اور بلتستان بھی مقامی بغاوت سے آزاد ہوئے۔ لیکن ایک معاہدے کی رو سے پاکستان کا ایک حصہ بنا دینے کے بعد ایک عارضی خطہ تھا۔ لیکن اب تک قائم ہے۔ پونچھ کی بغاوت میں ''مسلم

کانفرنس' یا ''مسلم کانفرنس'' کی آزاد فوج کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جو آزاد خطہ آزاد ''جموں وکشمیر'' کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا۔ وہ مہاراجہ کی جانشین حکومت کے طور پر ہی ابھرا تھا۔ اس وقت حکومت پاکستان نے بھی اس کا خیر مقدم کیا۔لیکن وقت' حالات اور سیاسی ناعاقبت اندیشی سے حالات نے اور ہی رخ بدل لیا جس کا تحریک آزادی اور کشمیر کے حالات پر بہت بُرا اثر پڑا۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائم ہونے والی حکومت ایک ''باغی حکومت'' ضرور تھی۔لیکن بین الاقوامی قانون کے تحت وہ کشمیر کی نمائندہ اور آئینی حکومت تھی۔لیکن رولز آف برٹش نے اس حکومت کو بہت نقصان پہنچایا۔

سب سے پہلے مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل جو کہ صدر کے انتخابی ادارہ کے طور پر تھی۔ کے اختیارات ختم کر دیئے گئے۔ صدر حکومت کے تمام اختیارات صرف ایڈوائزر کو دے دیئے گئے جن کے انتخاب میں صدر کی مرضی شامل نہیں تھی۔

آزاد کشمیر کی حکومت جو علاقہ آزاد ہو کر آزاد خطہ بنا اس میں بدقسمتی سے کوئی بھی ضلع مکمل نہیں تھا۔صرف مظفر آباد ہی ایک ایسا علاقہ تھا۔ جو پوری طرح آزاد ہوا۔ ریاست پونچھ ۱۹۴۷ء تک ''جاگیر'' سے منسوب ہے اس کی دو تحصیلیں پلندری اور باغ اور اس کے ساتھ تھوڑا سا حصہ تحصیل حویلی اور مینڈھر کا آزاد ہوا۔ اور اسے نئی حکومت میں ضلع پونچھ بنا دیا گیا۔

ضلع میر پور کا کچھ حصہ بھی مقبوضہ کشمیر کا حصہ ہی رہا۔ میر پور میں کوٹلی کو بحیثیت تحصیل شامل کیا گیا۔ اس طرح ۳ اضلاع۔ جن کا رقبہ تقریباً ۵۰۰۰ مربع میل ہے اور ۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۸ لاکھ تھی۔ آزاد کشمیر کے نام سے ریاست جموں وکشمیر کی نمائندہ حکومت کے طور پر ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آئی۔ سرحدی اضلاع گلگت اور بلتستان جن کا رقبہ تقریباً ۲۷ ہزار مربع میل ہے۔ حکومت

پاکستان نے ایک عارضی معاہدے کے طور پر اس کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ جو اب تک قائم ہے۔مگر یہ دونوں سرحدی صوبے کسی طرح بھی پاکستان کا حصہ نہیں۔ پاکستان کے سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق اور سلامتی کونسل میں پاکستان کے موقف کی بنا پر اور تاریخی حوالے سے یہ علاقے آزاد کشمیر کا حصہ ہیں۔لوگ تاریخ سے واقف نہیں۔ نہ ہی جاننے اور اس سلسلے میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے شاید یہ غلط فہمی کا ایک تاثر ہے۔ کہ گلگت اور بلتستان پاکستان کا حصہ ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جب کبھی کشمیر کا فیصلہ ہوگا۔ یہ علاقے کشمیر کے وسیع ملک کی ملکیت ہوں گے۔ اس عرصہ میں یہاں کے رہنے والوں نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ ہر طرح کی نمائندگی سے محروم رہے ہیں۔ انگریز کے زمانے میں بھی ان علاقوں کو کشمیر اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی۔ لیکن اس زمانے میں انہیں نہ تو آزاد کشمیر اور نہ ہی پاکستان میں کسی طرح کی نمائندگی حاصل ہے۔ جو جمہوریت کے اس دور میں ایک المیہ ہے۔ گلگت اور بلتستان کے لوگوں کے ساتھ سالوں سے بے انصافی ہو رہی ہے۔ بلکہ فرضی باتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ علاقے کبھی کشمیر کا حصہ نہیں تھے۔ تاریخ مسخ کرنے سے مسائل پیدا ہوئے ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ غلط باتوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ بلکہ حقائق سامنے لائے جائیں۔

آزاد کشمیر کی سیاسی جماعت لبریشن لیگ کے قائد کے۔ ایچ خورشید قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے تاریخ ساز سالوں میں کام کرنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ''تحریک پاکستان اور کشمیر'' کے متعلق کہتے ہیں۔

''تحریک پاکستان صرف پاکستان کے علاقوں یا مسلمانان برصغیر کی آزادی کی تحریک نہیں تھی۔ بلکہ پورے برصغیر کی آزادی کی تحریک کو منصفانہ اور حقیقت پسندانہ

ڈگر پر لانے کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آزادی اس شکل میں ہو۔ جس سے برصغیر کی تمام اقوام اور علاقے مطمئن ہوں ......''

تحریک پاکستان میں جو رہنما شامل تھے۔ ان میں اکثر و پیشتر وہی تھے۔ جو تحریک آزادی ہند میں بھی شامل تھے۔ ان میں قائداعظم سرفہرست ہیں۔ جو گاندھی سے قبل اور جواہر لعل نہرو کے والد موتی لال نہرو کے ہم عصر اور برصغیر میں آزادی کی روح رواں تھے۔ ان میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، نواب اسمٰعیل خان، چوہدری خلیق الزمان، حسین شہید شہروردی، مولوی فضل الحق، سردار عبدالرب نشتر، خان بخت جمال خان، محمد ایوب کھوڑو، حاجی عبداللہ ہارون، عبدالمتین چوہدری، مولانا جمال میاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان اور کئی دیگر ایسے بزرگ اور تحریک آزادی کے نام لیوا اور جان نثار بھی شامل تھے۔ انہوں نے خلاف تحریک اور آزادی کی تحریک میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں اور انگریزی سامراج کو للکارا............

قائداعظم کی یہ کوشش کہ پورے برصغیر کو ایک جدید جمہوری اور آزاد قوم میں تبدیل کیا جا سکے۔ کامیاب نہ ہوسکی۔ انصاف کے حصول حقوق انسانی کی تکمیل اور صحیح آزادی اور جمہوری اصولوں کا یہ تقاضہ تھا۔ کہ برصغیر کو تقسیم کر دیا جائے۔ تقسیم کی یہ تحریک ہی تحریک پاکستان بنی......

قائداعظم ایک منجھے ہوئے سیاسی اور انتہائی تجربہ کار قانونی ماہر تھے۔ انہوں نے اس تخیل کو اور مسلمانوں کی امنگوں اور اسلامی ملت کے تصور کو ایک جگہ کر کے جو نظریہ پیش کیا۔ وہ یہ تھا کہ قومیت کی یہ تعریف اب دنیا کے باقی حصوں میں بھی اپنائی جا رہی ہے۔ حکومت کی زبان محض ایک علاقہ یا زبان ہیں۔ بلکہ اس میں نظریہ حیات۔ فلسفہ زندگی اور عقیدہ بھی شامل ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ تھا۔ کہ ہر قوم کیلئے ایک وطن بنیادی ضرورت ہے۔ اور یہ علاقہ ان

ہی علاقہ جات پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ جہاں ان کی اکثریت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں وہی علاقے شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہ اصول جمہوری نکتہ نظر سے بھی ضروری تھا۔

مسلم لیگ کا یہ دعویٰ ہندوؤں اور انگریزوں نے مسترد کر دیا مگر یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہندوؤں میں کانگریس کے مشہور لیڈر اور مسٹر گاندھی کے سمدھی راجہ گوپال اچاریہ جو بعد میں بھارت کے گورنر جنرل بھی بنے۔ ۱۹۴۰ء میں ہی مسلم لیگ کے مطالبے کو تسلیم کرنے کی تحریک شروع کر دی تھی۔ بعض اچھوت لیڈر بھی اس کے حامی ہو گئے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی اس بات کو سمجھ گئے تھے۔ کہ برصغیر کی آزادی کا صحیح مفہوم مسلمانوں اور دیگر اقوام کو آزادی سے محروم رکھ کر پورا نہیں ہوسکتا۔

۱۹۴۵ء میں منعقد ہونے والی پہلی شملہ کانفرنس جو لارڈ ویول نے طلب کی تھی اس سوال پر ٹوٹی۔ کہ آیا مطالبہ پاکستان مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہے کہ نہیں۔ قائداعظم کے دعوے کو انگریزوں نے مسترد کر دیا۔ اور اب اس امر کا واقع ثبوت تب ہی مل سکتا تھا کہ انتخابات میں مسلمان مسلم لیگ کا ساتھ دیتے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ ان انتخابات میں اصل مسئلہ یہی تھا کہ پاکستان بننا چاہئے یا نہیں۔

برصغیر کی سیاست سے ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقسیم ہند کا فارمولا جو کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پیش کیا ریاستوں پر بھی لاگو تھا۔ اس کے برعکس ہے۔ برصغیر کے دو حصے سمجھے جاتے تھے۔ برٹش انڈیا اور انڈین انڈیا۔ یعنی وہی ریاستیں اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ وہی ریاستیں جن کی تعداد ۵۰۰ سے زیادہ تھی۔ اور جن میں حیدرآباد دکن، جموں کشمیر، بھوپال، گوالیار، جونا گڑھ جیسی ریاستیں بھی تھیں۔ براہ راست برطانوی حکومت کے ماتحت نہیں تھیں۔ ہر ریاست میں ایک الگ آئین اور دستور تھا۔ چنانچہ یہ

بات ۱۹۴۶ء میں ہی طے پا گئی تھی کہ برطانوی حکومت کے انتقال اقتدار کے بعد ریاستیں اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں گی۔ اور برطانوی تاج کی بالا دستی ختم ہو جائے گی۔

برصغیر کی دونوں بڑی جماعتوں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کا دائرہ کار بھی صرف برطانوی ہند تک ہی محدود تھا۔ ریاستی عوام سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا۔ اور نہ ہی ریاستوں میں ان جماعتوں کی شاخیں قائم تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ قائم کی گئی۔ جس میں مختلف ریاستوں کی مختلف تنظیموں کا الحاق تھا۔ اور اس کا تعلق آل انڈیا مسلم لیگ سے تھا۔ دوسری طرف سٹیٹس پیپلز کانفرنس تھی۔ جس کا تعلق کانگرس کے ساتھ تھا۔ دوسرے الفاظ میں کانگرس پارٹی اور مسلم لیگ کے فیصلوں اور نظریات سے تو ریاستی جماعتوں کو اتفاق تھا۔ مگر وہ جماعتی لحاظ سے اُن کی پابند نہیں تھیں۔

ریاستوں کے بارے میں قائداعظم نے بالکل واضع پالیسی اختیار کی۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ حکمران اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کر لے۔ اس کے برعکس کانگریس نے پہلے تو یہ حکمت عملی اختیار کی۔ کہ صرف عوام کی رائے کو مدنظر رکھا جائے گا۔ مگر بعد میں اس نے ریاستی حکمرانوں کی حمایت اور فوج کشی کا سہارا لیا۔ اس طرح سے حیدرآباد جونا گڑھ اور کشمیر میں یہ مسئلہ پیدا ہوا۔ کہ ریاست کا مستقبل کیا ہونا چاہئے۔ دراصل تحریک پاکستان اور آزادی ہند کے قانون اور قائداعظم کی پالیسی اور نظریہ پاکستان جو کہ جمہوری اساس پر قائم تھا کے مطابق ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

بھارت کو یہ یقین تھا کہ ریاست جموں وکشمیر کی اکثریت بھارت کے خلاف اور پاکستان کے حق میں فیصلہ کرے گی۔ حیدرآباد میں انہوں نے پہلے ہی نظام حیدرآباد کی

خوشامد کی۔ پھر دھمکیوں سے کام لیا۔ اور جب وہاں بھی ناکامی ہوئی تو پھر فوجی کارروائی کے ذریعے قبضہ کر لیا۔ ٹراونکور اور جونا گڑھ میں بھی ایسے ہی حربے استعمال کئے گئے۔ یہی چال کشمیر میں بھی چلی گئی۔ اور ریاست کے عوام کی بغاوت کو بہانہ بنا کر بھارت اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اور فوج کشی سے پیشتر حصے پر قابض ہو گیا............

۱۹۴۹ء میں اگر اقوام متحدہ کے احکام کے مطابق کشمیر میں ''جنگ بندی'' نہ ہوتی تو شاید کشمیر کا ایک کثیر حصہ آزادی سے سرشار پونچھ کے فوجی سرحد کے پٹھان اور جذبہ حریت سے سرشار ریاست کے رہنے والے کشمیر کو آزاد کروا لیتے۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ بھارت کی عیاری حکمت عملی اور بڑی طاقتوں کے رویے نے کشمیر میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جن سے تحریک آزادی۔ رائے شماری اور لوگوں کے حقوق کو بالکل پس پشت کر دیا گیا۔ شاید یہ ایک بہت بڑی اور گہری چال تھی۔ کہ ریاست کشمیر پاکستان میں شامل نہ ہو۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اس وجہ سے کشیدہ رہیں۔ جو گزشتہ ۶۳ برس سے ذرا بھی بہتر نہیں ہوئے۔ اس عرصہ میں دونوں ملکوں میں دو خونریز لڑائیاں بھی ہوئیں۔ لیکن دونوں طرف شدید جانی اور مالی نقصان کے باوجود وہی مسائل حل نہ ہوئے جو بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کا باعث ہیں۔

تحریک پاکستان کے بنیادی اصول آزادی جمہوریت اور اسلامی سماجی عدل و انصاف تھا۔ تحریک آزادی کشمیر کے بنیادی مسائل بھی یہ ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ریاست کشمیر جغرافیائی لحاظ سے تین اور آبادی کے لحاظ سے چار حصوں میں بٹ چکی ہے۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ پوری ریاست کو آزاد کیا جائے اور پھر عوام کی مرضی کے مطابق ان کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔ اس حقیقت کو اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کیا ہوا ہے اور بھارت نے بھی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ نیک نیتی سے کوئی بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب ریاست کشمیر کا یہ حصہ آزاد ہوا۔ جسے ہم آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ اس وقت یہ بات واضح تھی کہ ریاستی عوام مہاراجہ کشمیر کی حکومت کو ریاست کی آئینی اور نمائندہ حکومت تسلیم نہیں کرتے۔ حکومت پاکستان نے بھی اس آزاد خطے کے وجود کا خیر مقدم کیا۔ یہ حکومت نہ مسلم کانفرنس نے قائم کی تھی اور نہ ہی مسلم کانفرنس نے آزاد کشمیر فوج کو ترتیب دیا تھا۔ یو ایس او کی دو قراردادوں جو ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو پاس ہوئیں۔ سے جنگ بندی کا اعلان ہوا تھا۔ تو اس حکومت کا مسلم کانفرنس سے کوئی آئینی تعلق نہیں تھا۔ لیکن افسوس اس کے بعد حالات نے ایسا رخ اختیار کیا۔ جس سے نہ صرف تحریک آزادی کو زک پہنچی۔ بلکہ آزاد خطے کے نظم و نسق میں بھی بدانتظامی ہوئی اور لوگوں کے بنیادی حقوق بھی پامال ہوئے۔ ایسے وقت میں ہمارا عمل۔ ہمارا انداز فکر ہماری سوچ تحریک آزادی کو بہت تقویت پہنچا سکتی ہے۔ ملک میں مختلف تنظیمیں تحریک آزادی کشمیر کے لئے کام کر رہی ہیں۔ عملی طور پر اسی صورت میں یہ قابل عمل اور با اثر ہو سکتا ہے۔ اگر آزاد کشمیر کی کوئی الگ اور آئینی حیثیت ہو یہی ایک راستہ ہے۔ یہی ایک حل ہے۔ جس سے ہم آزادی کی منزل پا سکتے ہیں۔ آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ کشمیر یا کشمیر کے آزاد خطے' آزاد کشمیر کے متعلق باہر کی دنیا میں لوگوں کو بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ وہاں تو پاکستان کے متعلق بھی لوگ اندھیرے میں ہیں۔ کوئی اسے برما سے ملاتا ہے۔ کوئی اسے افغانستان کا حصہ سمجھتا ہے کوئی اُسے بھارت سے ہم آہنگ سمجھتا ہے۔ کشمیر کے مسئلے کے متعلق بھی جو تھوڑی سی معلومات ہیں۔ لوگ اس مسئلے کو بھارت اور پاکستان کا سرحدی جھگڑا کہتے ہیں۔

یہ افسوس ناک بات ہے۔ کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں ہم دنیا کے نقشے میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اس میں صرف ہماری محدود سوچ اندرونی سازشیں۔ حکومتوں کی

ناعاقبت اندیشی اور طاقت کا جھوٹا نشہ ان اندھیروں کے ذمہ دار ہیں۔ برصغیر کو تقسیم ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ یوں تو ملکوں کی تقدیریں دنوں میں نہیں بدلتیں۔ کتنے عہد بدل جاتے ہیں۔ کتنی صدیاں بیت جاتی ہیں او وقت ٹھہرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن برصغیر کا بٹوارہ کچھ اس طرح کا ہوا۔ کہ آخری لمحوں تک کسی کو علم نہیں تھا۔ کہ اس کا علاقہ بھارت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ اس لئے آبادی کے تبادلے کے ساتھ بہت قتل عام ہوا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے۔ اور اپنے وطن کو آبدیدہ ہو کر چھوڑنے پر مجبور ہوئے جہاں ان کا ماضی تھا۔ ان کے بزرگوں کی ہڈیاں تھیں۔ اس کا لمس محسوس ہوتا تھا جو کھو گئے تھے۔ لیکن وہاں ان کی موجودگی کا احساس باقی تھا۔ ریاستوں کے فیصلے تو اور بھی مایوس کن تھے۔ لوگوں کی رائے اور حکمرانوں کی مرضی پر ان کی تقدیر ثبت کر دی گئی تھی۔ انگریز برصغیر کو چھوڑتے ہوئے یہاں کے لوگوں کو آگ اور ہولی میں جھونک گئے تھے۔ تاریخ ہمیشہ خود کو دہراتی ہے۔ ظلم ہوتا ہے۔ جارحیت ہوتی ہے اس طرح غیر لوگ حکمران بن جاتے ہیں۔ جن کا حق نہیں ہوتا۔ اپنا حق لینے کیلئے بھی طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ بھی کچھ اس بری طرح الجھ کر رہ گیا ہے۔ سیکورٹی کونسل میں برسوں تک ایجنڈے پر رہنے کے باوجود اس کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ وفود آئے گفت و شنید ہوئی۔ اعلانات ہوئے۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ نکل سکا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان بھی معاہدہ تاشقند اور معاہدہ شملہ طے پایا۔ دو خونریز جنگیں ہوئیں۔ لیکن ملک کی تقدیر وہیں استادہ رہی۔

کشمیر کی تاریخ ویسے بھی ہمیشہ آہوں۔ اور سسکیوں سے وابستہ رہی ہے۔ یہاں غیر آتے رہے۔ حکمران بنتے رہے اور یہاں کی خوبصورت اور پرامن وادیوں کو پامال بھی کرتے رہے۔ ہندوستان کی پرانی تاریخ میں اندھیرا ہے۔ اور کوئی ربط نہیں۔ صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اور کسی تاریخ دان کو کوئی تحریر نظر نہیں آتی۔ لیکن خوش قسمتی سے کشمیر کی پرانی تاریخ کا ایک باقاعدہ ریکارڈ مشہور براہمن کلہن کی شہرہ آفاق کتاب

راج ترنگی، جس کا مطلب بادشاہوں کا دریا ہے۔ اور جو سنسکرت زبان میں ہے اور جس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں میں محفوظ ہے۔

ان ہی تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ تیسری صدی قبل از مسیح میں مہاراجہ اشوک جو موریہ خاندان کا ایک نامور ہندوستان سے آنے والا پہلا راجہ تھا۔ جس نے وادی کی پرسکون فضاؤں کو اپنی سلطنت کا ایک اہم صوبہ بنایا۔ خود بھی کشمیر آیا اور اس کے آنے کی غرض ایک تو وادی کے طول وعرض میں بدھ مت کی تبلیغ تھی۔ دوسرا موجودہ سری نگر جو ریاست کشمیر کا دارالخلافہ ہے۔ کی بنیاد میں مہاراجہ اشوک نے ہی رکھی۔ ویسے پنڈت کلہن کے تاریخی حوالوں کے مطابق کشمیر کا پہلا حکمران گوننده تھا جس نے سب سے پہلے حکومت قائم کی۔ پرانا سری نگر شہر جہاں اب جھیل ولر بہتی ہے۔ ۱۱۲ء میں بنا۔ تاریخ کشمیر کے تین مصنفین محمد دین فوق، نوراحمد چشتی اور غلام محی الدین۔
اس نے اس راجہ کے ساتھ شہر کی تکمیل منسوب کی ہے۔

......☆......☆......☆......

۸۸۴ء میں ایک فاتح علم دوست اور فنون لطیفہ کے شائق راجہ اونتی ورمن کی وفات کے بعد کشمیر کی تاریخ پر اندھیرا چھا گیا بہت سالوں کے بعد ایک مہارانی ویدا کا ذکر تاریخ میں آتا ہے۔ جو ظالم اور مطلق انسان تھی۔ اور گندھارا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ۱۰۱۵ء میں مشہور مسلمان فاتح جسے تاریخ محمود بت شکن کے نام سے یاد کرتی ہے اور جس نے ہندوستان پر ۱۴ حملے کر کے ان کی بے شمار دولت غزنی پہنچائی۔ اس نے بھی کشمیر پر راجوری کے مقام سے حملہ کیا۔ لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ وادی کی طرف نہ جا سکا۔

یہاں کشمیر کی ابتدائی تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ جس کے اندھیروں اور اجالوں میں آزادی کی ایک سسکتی ہوئی تڑپ ہے۔ ظالم بادشاہوں کی ان گنت داستانیں ہیں۔ اور مصنف اور اچھے حکمرانوں کے حصے بھی ہیں۔ لیکن ان سب واقعات میں دبی دبی مظلوموں کی جو آہیں بھی ہیں۔ جو آزادی اور حقوق انسانی کیلئے ترستے رہے ہیں۔ صدیوں کے بعد اس وقت بھی وادی کشمیر میں آزادی اور حقوق انسانی کی تڑپ ہے۔

یوں گویا وقت ٹھہر گیا ہے۔کشمیر کا الجھا ہوا مسئلہ اس وقت انسانیت کیلئے ایک چیلنج ہے۔ وہاں کا نوجوان اس وقت بھارت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ وہ بھارت کے غاصبانہ قبضے سے جو تقریباً نصف صدی سے ان کے ملک کا زبردستی حکمران بن گیا ہے۔آزادی چاہتا ہے آزادی جو ایک نعمت ہے۔جس کیلئے قصیدے لکھے گئے۔شاعروں نے نظمیں کہیں ...... آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ آزادی کی حفاظت اور اسے حاصل کرنے کے لئے قومیں جو قربانی دیتی ہیں۔اس کے تذکروں سے تو تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ ہر دور میں ہر ملک میں شاعر' ادیب اور تاریخ دان آزادی کی جدوجہد اور اس تڑپ کا ذکر کرتے ہیں۔اور اسے اپنی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔

کشمیر کی پرسکون وادیوں میں ظلم اور بربریت کی ناقابل بیان تڑپ ہے۔عرصہ کئی سالوں سے اس آزادی کی دبی دبی تحریک سے لوگوں کا کاروبار معطل ہو گیا ہے۔ بھارت کی معظم افواج کا ظلم' لمبے اور ناختم ہونے والے کرفیو کے اوقات۔عورتوں کی بے حرمتی نوجوانوں کی شہادت اور بچوں پر ظلم تو روز کا معمول ہے۔

سربفلک پہاڑوں سے گھیری ہوئی خوبصورت وادی جہاں پھولوں کی مہک سے فضا معطر رہتی تھی۔ اور وہاں کی شفاف ندیاں اور آبشاریں جھرنوں کی طرح گنگناتی تھیں۔ وہاں اب بارود اور اسلحے کی ہیبت ناک خوشبو بھی آتی ہے۔جھیل ڈل کے گردونواح میں رہنے والے آبی گھاس کھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔جس سے لوگ بیماری کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان علاقوں میں زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش ہاؤس بوٹس اور کشتیاں ہیں۔ ان کا کاروبار معطل ہو گیا ہے۔جھیل ڈل اور اس کے گردونواح میں جہاں بہتے پانی میں کنول تیرتے تھے۔ اب ایک فوجی چھاؤنی بن گئی ہے۔ اس کے باوجود بھارت بوکھلا گیا ہے۔ ہر دباؤ اور تشدد کے باوجود وہ تحریک آزادی کو کچل نہیں

سکے۔ بیرونی دنیا میں بھی بھارت کے پاس کشمیر کے مسئلے پر کہنے کو کوئی ٹھوس بات نہیں۔ وہ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ کہتے ہیں اور پاکستان پر الزام دیتے ہیں۔ کہ وہ ریاست میں دہشت گرد بھیجتا ہے۔ اور ریاست کے حکمرانوں اور بھارت کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے۔

1239ء میں کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی۔ ان سلطانوں میں سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین جیسے بادشاہ بھی پیدا ہوئے۔کشمیر میں بیس سلطانوں نے حکومت کی۔ درمیان کا طویل عرصہ سیاسی بدامنی مختلف راجاؤں کی تخت کے لئے تگ و دو اور ان کی نااہلیت کے خطوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں سوائے راجہ ہرش کے کوئی قابل ذکر راجہ کشمیر میں نہ آیا۔ وہ بھی شمالی ہندوستان کا حکمران تھا اور کشمیر اس کی ریاست کا ایک دورافتادہ حصہ تھا۔

کشمیر کے آخری راجہ نے ایک مسلمان درویش بلبل شاہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ اور اس طرح ہندوؤں کی حکومت ختم ہوئی۔ ایسے بے شمار درویشوں اور صوفی بزرگوں نے وادی کی ظلمتوں میں ایمان اور اسلام کی روشنی پھیلائی۔ترکستان اور شمالی ملکوں کے دور دراز کے علاقوں سے اس کٹھن زمانے میں دشوار گزار پہاڑی راستوں سے سفر کر کے ایسے بزرگ وادی میں اسلام کی روشنی پھیلاتے رہے۔جس کے نتیجے میں ملک کی ۸۰ فی صد آبادی مسلمان ہو گئی۔

کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران سلطان صدرالدین تھا۔ اور یوسف شاہ چک کشمیر کا آخری خودمختار سلطان تھا۔جس کی حسین وجمیل بیوی صبا خاتون ایک شاعرہ تھی۔ وہ خود بھی شاعر تھا۔ دونوں شعر وشاعری اور حسن سے محبت کرتے تھے۔شاید اپنے ملک کی سیاست استحکام پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان

کے وزیراعلیٰ نے مغل شہنشاہ اکبر کو کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ جس کا وہ شاید منتظر تھا۔ اس طرح 1676ء میں کشمیر کی آزادی ختم ہوگئی۔ اور وہ مغلیہ سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ مغلوں نے اس خوب صورت ملک میں باغات لگوائے۔ پل' سڑکیں اور قلعے تعمیر کروائے۔ مغل عمارات اور وہاں کے فنون لطیفہ میں حکمرانوں کی گہری دلچسپی سے ایک ایسی تہذیب معرض وجود میں آئی جس کا ملک کے متمدن اور رہن سہن پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اور اس کے اثرات ہمیشہ کیلئے یہاں کی تہذیب میں مثبت ہوگئے۔

مغلطیہ خاندان نے کشمیر پر ۱۵۷۶ء سے ۱۷۵۲ء تک حکومت کی اور اس کے تقریبا ۱۵۰ گورنر کشمیر کا نظم ونسق قابلیت سے سنبھالتے رہے۔ جس میں بادشاہ کی خوشنودی اور دلچسپی موجود تھی جہانگیر نے تو کشمیر کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ ہر سال کشمیر آتا۔ اور گرمی کا موسم یہاں گزارتا۔ جب اس کی وفات ہوئی۔ اس وقت بھی وہ کشمیر سے واپس دہلی جا رہا تھا۔ کہ راجوری کے مقام پر اس کا انتقال ہوا۔ جس کو مصالحے لگا کر محفوظ کرلیا گیا۔ تاکہ دارالخلافہ تک پہنچنے میں خراب نہ ہو۔ لیکن اس کی انتڑیاں راجوری میں ہی دفن ہیں۔ جہاں بعد میں یادگار کے طور پر ایک بارہ دری بنائی گئی۔ جو اب تک موجود ہے۔

کشمیر میں مغلوں کے بعد افغانوں کی حکومت شروع ہوئی۔ جو ۱۷۵۴ء ۱۸۱۹ء تک قائم رہی۔ اس دور کو کشمیر میں ''دورستم'' کہا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ تہذیب کی قدر کی۔ نہ اُن پرسکون وادیوں کے حسن سے لطف اندوز رہے۔ جنگ جدل کے شائق افغان' جن کا شوق صرف بندوق چلانے تک محدود ہے۔ حسن اور لطافت کی باریکیوں سے بہت دور ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال افغانستان کے طویل جہاد اور طویل لڑائی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ لطافت اور حسن اور رومان ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا۔

افغانوں نے کشمیر کو ایک صوبہ اپنا ضرور بنایا۔ لیکن اس میں کسی طرح کی دلچسپی نہ لی۔

افغانوں کے بعد سکھ کشمیر کے حکمران ہوئے جو ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک رہا۔ سکھوں کی تمام تر توجہ پنجاب میں مذکور تھیں۔ کشمیر تو ان کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ جس کی اہمیت کا شاید انہیں اندازہ نہیں تھا۔ چنانچہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان لڑائی کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ امرتسر طے پایا۔ جس سے ۸۴ ہزار مربع میل کی وسیع اور خوبصورت ریاست جس کے مرغزاروں پر روپہلی دھوپ اور سفید برف محیط رہتی ہے۔ اور جس کے ندی نالے گنگناتے ہیں جن کی برف پوش پہاڑیاں دنیا کی خوب صورت ترین اور بلند ترین چوٹیاں بھی ہیں اور ۵۰ لاکھ کی مظلوم آبادی کی ریاست جموں وکشمیر ۷۵ لاکھ روپے میں ڈوگروں کے ہاتھ بیچ دی گئی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ جو اس وقت جموں کا راجہ تھا۔ جموں کے قریب ۱۷۷۲ء میں ایک غریب گھر میں پیدا ہوا۔ جوان ہونے پر منگلا کے ایک جاگیردار کے پاس بطور سائنس ملازم ہوا۔ جہاں اس کی تنخواہ تین روپے ماہوار تھی۔ بعد میں سلطان بھمر کا ملازم ہوگیا۔ سلطان کی وجہ سے ہی اسے لاہور میں سکھ دربار میں منسوب ہوا۔ اور اپنے دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ جن کا نام دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ تھا۔ سکھ فوج میں ملازم ہوگیا۔ ذہانت' بہادری اور مردانہ وجاہت کی وجہ سے رنجیت سنگھ ان پر بہت مہربان ہوگیا۔ تینوں کو جاگیریں دیں۔ گلاب سنگھ کے حصے میں جموں کی جاگیر آئی۔ بعد میں تاریخ کی ستم ظریفی اور حالات سے وہ ریاست کشمیر کا راجہ بن گیا۔ ڈوگروں نے ۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ریاست جموں وکشمیر پر حکومت کی۔ گلاب سنگھ کی اولاد میں ہی ریاست کا آخری راجہ ہری سنگھ تھا۔ جس نے پورے سو سال کے بعد تاریخ میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کیا۔ ۸۰ فی صد مسلمانوں کی آبادی والی ریاست جس کی سرحدیں

پاکستان سے ملتی ہیں۔ مذہب ملت کے علاوہ جغرافیائی لحاظ سے متمدن کے لحاظ سے پاکستان سے ہم آہنگ ہیں۔ ایک عارضی سمجھوتے سے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا۔ جو وقت کے ساتھ ایک مستقل الحاق بن گیا۔ راجہ ہری سنگھ کو بھی بھارت نے ذلیل کیا۔ محسن کشی کی۔ ریاست کشمیر نے اسے نکال دیا۔ ساری زندگی گمنامی سے اس نے بمبئی میں گزار دی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کرن سنگھ جسے بھارت نے صدر ریاست بنا دیا تھا۔ سے بھی دور رہا...... مہارانی تارا دیوی۔ جو بھارت کے ساتھ الحاق کی حامی تھی۔ اور جن سنگھی کٹر ہندوؤں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ اپنے شوہر سے دور رہی۔ کچھ عرصہ سری نگر میں نشاط باغ کے ساتھ ایک کوٹھی میں مقیم رہی۔ پھر دہلی میں جلاوطنی میں ایک گمنام موت مر گئی۔ مہاراجہ بھی اسے زندگی میں پھر کبھی نہ ملا۔ اسے بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا۔ کہ مہارانی نے اسے ایسی دلدل میں پھنسا دیا تھا۔ جس سے تخت و تاج کے ساتھ اس کا ملک بھی اس سے چھن گیا تھا۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ جب ہم اپنی ہی غلطیوں سے ایسا خمیازہ برداشت کرتے ہیں۔ جس کا کوئی مداوہ نہیں ہوتا۔ صرف پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔ ۱۸۴۶ء کے معاہدہ امرتسر کی طرح۔ ۱۹۴۶ء کا یہ الحاق بھی ایک شرمناک فعل تھا۔ تاریخ والوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کے برصغیر میں دورحکومت میں سب سے زیادہ شرمناک معاہدہ امرتسر کا معاہدہ تھا جس سے ایک ملک اور اس کے لاکھوں لوگ ایک جابر اور ظالم ڈوگرہ مہاراجہ کے پاس بک گئے۔ جس کے جانشینوں نے ایک سو سال تک اس وادی کے رہنے والوں پر ظلم و ستم ڈھائے اور ان سے جینے کا حق بھی چھین لیا۔

کشمیریوں نے بہت دور دیکھے۔ بڑی بادشاہیاں دیکھیں' ظالم حکمران بھی ان پر مسلط ہوئے۔ غیر ملکی لوگ اس حسین خطے پر حکومت کرتے رہے۔ عیش و عشرت کرتے

رہے اور غریبوں کا خون چوستے رہے۔ اس دھرتی کے رہنے والوں کیلئے ظلم کی ایک ناختم ہونے والی دستان بار بار دہرائی گئی لیکن ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم شاید ان سب بے انصافیوں سے زیادہ تھے۔

گزشتہ صدی میں ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار دی پنجاب' لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر ایک انگریز تھا۔ اس نے ۹ مئی ۱۸۵۷ء میں اپنے اداریے میں کشمیر کے متعلق لکھا جو مہاراجہ گلاب سنگھ والئی کشمیر کے ظلم و تشدد کے متعلق تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

حسن پرست' ہوس کار اور دیگر تمام خرابیوں کا مرکب گلاب سنگھ ظلم و تشدد سے کشمیر کی وادی کو صحراؤں میں تبدیل کر رہا ہے ان چٹانوں اور پہاڑوں سے جو کشمیر کو برطانوی ہند سے جدا کرتے ہیں۔ اکے دکے بدنصیب کشمیری مسلمان چوری چھپے برطانوی ہند میں چلے آتے ہیں۔ کبھی بلند آواز سے کبھی کھسر پھسر سے اس آدمی کو گالیاں دیتے ہیں اور وہ بدنصیب جو کسی وجہ سے وہاں سے بھاگ نہیں سکے۔ ان کے چہروں پر رنج والم کا بسیرا ہے۔

ایک روشن خیال عیسائی حکومت برطانیہ نے کرہ ارض کا حسین ترین خطہ اس شیطان کے رحم و کرم پر پھینک دیا ہے۔ سیاسی ضرورت کی بنا پر یہ حسین ملک ۷۵ لاکھ کی مالی ضرورت پورا کرنے کیلئے ہم نے پوری آبادی سمیت اسے ایک بدترین ڈوگرہ کے حوالے کر دیا ہے۔ اس حد تک بدکاریوں اور جنسی جرائم میں ڈوبا ہوا کہ روم کے درندہ صفت امریزادا اور کیکی گولہ بھی اسے دیکھ کر کانپ جاتے۔ گلاب سنگھ نے اس درندگی جنسی پن اور پاگل پن کو تازہ کیا ہے جو قدیم روم نے اپنی گلیوں اور بازاروں میں دیکھا تھا جہاں انسانیت سر عام ننگی ہوئی تھی۔

اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی حالت اب بھی وہی ہے جو گزشتہ صدی کے

وسط میں تھی ایک انگریز صحافی گلاب سنگھ کی ہوس پرستی ظلم پرستی، ظلم اور بربریت سے آبدیدہ ہو گیا لیکن حالات یہی ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت یہی چاہتی تھی کہ مسلمانان کشمیر پر ظلم وتشدد ہو اور وہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔ ۱۹۴۷ء میں بھی یہی کہانی دہرائی گئی۔ حقائق کو جھٹلاتے ہوئے۔ مسلم اکثریت کو نظر انداز کرتے ہوئے انگریزوں کی دوغلی پالیسی سے کشمیر پھر بھارت کا حصہ بن گیا۔ جہاں مسلمانوں کا وقار اس کا ایمان بھی کچلا گیا۔ ظلم ہوتا رہا۔ ہندو باہر سے لاکر ریاست میں آباد کئے گئے ۸۰% مسلمان آبادی ان چند سالوں میں گھٹتی گئی اور مسلمانوں کے تقدس ان کی روح ان کی انا ان کی سوچ سب کچھ مجروح ہوتی رہی۔

مسلمان اپنے حقوق کے لئے ہر بار کھڑے ہوتے اب کشمیر میں تحریک آزادی کوئی نئی تحریک نہیں۔ حقوق کے تحفظ کی جدوجہد میں ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کا واقعہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ جب سری نگر جیل کے باہر ڈوگرہ پولیس نے نہتے کشمیریوں پر گولی چلائی اور ۲۰ مسلمانوں کو شہید کر دیا جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ اس دن جیل میں عبدل قدیر نامی ایک سیاح کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ کی سماعت جاری تھی۔ عبدل قدیر جو کسی انگریز سیاح کے ساتھ ملازم کی حیثیت سے آیا تھا اور جس کا تعلق سوات سے تھا۔ جمعہ کی نماز کیلئے مسجد میں گیا تھا۔ اس جمعہ کو مسجد میں ہزاروں کی تعداد میں کشمیری جمع تھے اور خطبے کے بعد ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ عبدل قدیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے بھی بہت پر جوش تقریر کی اور ان مظالم کی مذمت کی۔ عبدل قدیر کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ درج ہو گیا اور اس کی سماعت کھلی عدالت کی بجائے جیل کے اندر شروع ہوئی۔ مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ۱۳ جولائی کو اس مقدمہ کا فیصلہ عبدل قدیر کے خلاف سنایا جانے والا ہے۔ چنانچہ وہ

ہزاروں کی تعداد میں جیل کے باہر جمع ہو گئے اور ان نہتے کشمیریوں پر ڈوگروں نے بے وردی سے گولی چلادی۔

کشمیری اپنی آزادی اور بقا کے لئے ہمیشہ ظالم سے بنرد آزما رہے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ گزشتہ چار سالوں سے جس تحریک نے وادی کے طول وعرض میں زور پکڑا ہے۔ وہ اپنی نوعیت سے ایک منفرد تحریک ہے۔ کشمیر کی خوبصورت گھاٹیاں جس کی ڈھلی ڈھلی فضا میں ڈوبتے آفتاب کا گہرہ نارنجی عکس، پہاڑوں کے مٹیالے اور دھندلے سایوں میں برا جاذب نظر ہوتا ہے جس کے بلند قامت درخت رات کو بھی نیلے آسمان کی ضیاء پاشیوں سے مثبت اچھے لگتے ہیں۔ جھیلوں کا ساکن پانی جن میں سفیدے کی چاندی سے بلند درختوں کا جب سایہ پڑتا ہے۔ تو یوں لگتا ہے گویا ساغر میں مے چھلک رہی ہو۔ اب اس حسین گھاٹیوں اور پر فضا وادیوں کے خوبصورت ملک میں جھرنوں کی راگنی اور درختوں کی سرسراہٹ کی بجائے گولیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جہاں پھولوں کی بھینی مہک کی بجائے بارود کی مہک ذہن کو مکدر کرتی ہے۔ جہاں کے بہتے پانی، جہاں کنول کے ارغوانی اور بنفشی پھول کھلتے تھے۔ لاشوں سے بھر گئے ہیں۔ جہاں لوگ روز اپنے شہیدوں کی گنتی کرتے ہیں۔ جہاں قبرستانوں میں روز نئی قبروں کا اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں خاندانوں میں جوان نسل ختم ہو گئی ہے۔ جہاں نئی نویلی دلہن اپنے شوہروں کا انتظار کرتے کرتے ہجر کی راتیں گزارتی ہیں۔ جہاں کنواری لڑکیاں اپنے خوابوں کے شہزادے کے ملال میں قبل از وقت بوڑھی ہو گئی ہیں۔ جہاں ماں اپنے جوان بیٹوں کے انتظار میں ساری ساری رات دہلیزوں پر گزار دیتی ہیں۔

اس ملک کی داستاں بڑی رولا دینے والی ہے۔ اشکوں اور سسکیوں کی ایک کہانی ہے۔ جو جانے کب ختم ہو گی اور وہ صبح کب طلوع ہو گی۔ جب مادرِ وطن آزاد ہو گا۔

سکون کی فضا نصیب ہو گی اور لوگ چین کی نیند سوئیں گے۔ اس وقت تو کشمیر میں شہیدوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ پھر زندہ جلائے جانے والے لوگ' عورتوں پر مظالم بھارتی تشدد گاہوں میں اذیت ناک واقعات' خواتین کی عصمت دری' جیلوں میں قیدیوں کی بھرمار' جائیدادوں کی آتشزدگی' اور ایسے بے شمار انسانیت سوز مظالم کی داستان روز دہرائی جاتی ہے۔ جن سے نازیوں اور جاپانیوں کی بربریت بھول جاتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا میں ایسے دل ہلا دینے والے مظالم بھی ہوتے ہیں اور دنیا کا ضمیر نہیں جاگتا۔ اس وقت دنیا میں بیشمار تنظیمیں ایسی ہیں جو اس مسئلے میں بھارت کے مظالم کے خلاف مہذب دنیا کو لوگوں پر ڈھائے جانے والی ان انسانیت سوز حرکات کے لئے آواز بلند کرتی ہیں۔ اخباروں میں لکھا جاتا ہے۔ ایسے وفود بھیجے جاتے ہیں۔ جو اس تشدد کو بے نقاب کریں۔ بہت کچھ ہوا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے بھی مختلف پلیٹ فارم سے آواز اٹھائی ہے۔ لیکن شاید یہ کافی نہیں۔ اس سلسلے میں دنیا کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی اور اس کی حرمت کے تحفظ کا سوال ہے۔ جو اس وقت بے دردی سے پامال ہو رہا ہے۔ کشمیر کے مسئلے کے پرامن حل کی ضرورت ہے۔ جس میں ۱۹۴۷ء کے تقسیم کے فارمولا کے تحت سیکورٹی کونسل کے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کے ریزولیشن کے مطابق لوگوں کو رائے شماری کا حق دے کر ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنا اس مسئلے کا اولین حل ہے۔ کشمیر کی وحدت بھی اہم ہے اور اسے پاکستان میں شامل ہونے کا حق وہاں کے رہنے والوں کی مرضی کے مطابق ہے۔ بے شک بھارت اس سلسلے میں تقسیم کشمیر کا غیر منصفانہ قدم بھی اٹھائے۔ اس کے سرحدی افلاخ کو ہریانہ یا ہماچل پردیش میں شامل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ صرف جذبات کے فیصلے نہیں۔ اس میں تاریخی حقائق اور ریاست کے لوگوں کی

بے مثال اور طویل قربانی شامل ہے جو بھارت کے غاصبانہ قبضے کے باوجود ایک قوت بن کر اپنے حقوق اور آزادی کے تحفظ کے لئے اس وقت کھڑے ہو گئے ہیں۔ جس کو نہ بھارت کی فوجی قوت کچل سکی ہے۔ نہ ان کے ناقابل بیان مظالم۔ نہ ہی ان کی حکمت عملی۔ جس سے وہ بھارت کو اکھنڈ بھارت' بنانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ ہندو بنیادی طور پر متعصب ہے اور مسلمانوں کو اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے برصغیر پر ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ انہیں اس سرزمین کا باشندہ نہیں مانتا۔ ان کے طرز عمل پالیسی اور رویے سے ہمیشہ یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمان باہر سے آکر برصغیر میں آباد ہوئے اور اس کے باوجود کہ انہوں نے اپنی عظمت کے ان گنت نشان برصغیر کے رہنے والوں پر ثبت کئے۔ تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہوئے۔ رہن سہن اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں انہیں ترقی کی منزل تک پہنچایا۔ لیکن ہندو مسلمان کو غیر سمجھتا ہے جس کا اس دھرتی سے کوئی تعلق نہیں۔ حال ہی میں بابری مسجد' کی شہادت اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو نے کبھی مسلمان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ ۳ لاکھ ہندو جب ایک قافلے کی صورت میں مسجد کو مسمار کرنے کے لئے اجودھیا کی طرف بڑھے تو بھارت سرکار نے بھی انہیں نہ روکا۔ یہ ایک المیہ ہے اور ہندو ذہنیت کی پستی ہے۔

کشمیر ایک جوالا مکھی ہے۔ اسے آسانی سے درگزر نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ برصغیر کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیاء کا امن اور تحفظ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ دنیا میں ویسے بھی اس وقت آزادی کی ایک لہر آئی ہوئی ہے۔ دیوار برلن کے گر جانے اور سوویت روس کی ساری ریاستوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے بین الاقوامی حالات بھی بہت بدل گئے ہیں اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ زبردستی اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر کسی قوم کو محکوم نہیں کیا جاسکتا اور پھر جب سے افغانی اور ایشیائی حقوق کی پامالی بھی ساتھ ہو۔ بھارت

کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے۔ اور کشمیر کو اپنا داخلی مسئلہ کہتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ ۱۲ کروڑ انسانوں کی بقاء ان کی عزت نفس اور ان کے تشخص کا مسئلہ ہے۔ اسے کس طرح روندا جا سکتا ہے۔ ظلم زیادہ دیر تک برداشت بھی نہیں ہوتا۔ اور شاید وہ گھڑی آ گئی۔ جب بھارت کو کشمیر سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے حل میں معاہدہ تاشقند' معاہدہ شملہ یا کوئی اور گفت وشنید حائل نہیں۔ بلکہ وہاں کے رہنے والوں کی رضا اور ان کے مقاصد کا حصول درپیش ہے۔ بھارت تو زبردستی ان خوبصورت گھاٹیوں اور بہتے ندی نالوں کے حسین ملک پر قابض ہو گیا ہے وہ اس کے نہیں ہیں۔ اس لئے اسے ان تمام مظالم کا حساب چکانا پڑے گا جو ان پر امن وادیوں کے رہنے والے پرامن لوگوں پر اس نے ڈھائے۔

اس لئے کشمیر جو میرا وطن ہے۔ میری پہچان ہے۔ میری آن ہے اس کیلئے دیار غیر میں جانا میرے لئے ایک چیلنج تھا۔ ماضی کے جھروکوں سے مجھے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۴ء تک خورشید آزاد کشمیر کے صدر تھے اور ہم نے وہ چند سال آزاد کشمیر میں گزارے تھے۔ اس عمر کے نقوش بڑے دیرپا ہوتے ہیں۔ بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ بڑے دلآویز ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں گھنٹوں پریزیڈنٹ ہاؤس کے پچھواڑے میں ان پہاڑوں کو دیکھا کرتی تھی۔ جس کے پیچھے میرا وطن تھا۔ جو غیروں کے قبضے میں تھا۔ یوں تو کشمیر کا ذرہ ذرہ جس میں آزاد کشمیر کا علاقہ بھی شامل ہے۔ میرا ملک ہے۔ میرا وطن ہے۔ اس کی مٹی مجھے سوندھی لگتی ہے۔ اس کی ہوائیں مجھے محبت کا پیغام دیتی ہیں۔ اس کے دریا مجھ میں تلاطم برپا کر دیتے ہیں۔ وہاں کے پہاڑ مجھے اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ لیکن کشمیر کا وہ حصہ جو بھارت کے پاس ہے۔ جو وادیٔ کشمیر کی وسیع گھاٹیوں پر مشتمل ہے۔ جس کے بہتے ندی نالوں کی راگنی پھیکی پڑ گئی ہے۔ جہاں

کے کوہساروں پر سوگواری کیفیت طاری ہے۔ جہاں کے سبزہ زاروں میں خزاں کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں کی وادیوں کا حسن اداس ہے۔ ہمیں پکارتے ہیں کہ سرحد کے اس پار رہنے والے اس کے بھائی ہیں۔ انہیں غیروں کے تسلط سے آزاد کروائیں۔ آزادی کی جنگ تو اپنوں نے شروع کر دی ہے۔ ہمیں اس کا ساتھ دینا ہے اور بین الاقوامی سطح پر ان کے حقوق کے لئے لڑنا ہے۔

......☆......☆......☆......

سالوں پہلے بھی آزاد کشمیر میں اپنے قیام کے دوران میں وطن میں رہنے والے محکوم لوگوں کے دل کی دھڑکن سنا کرتی تھی اوران کے لئے دکھی ہوتی تھی۔ پریزیڈنٹ ہاؤس ان دنوں بہت مختصر تھا صرف دو بیڈروم کا گھر تھا۔جس کے سبزہ زار وسیع تھے۔ بار ہا جب کوئی بہن بھائی ہمیں ملنے آتے۔تو بچوں کا کمرہ ان کے لئے خالی کرنا پڑتا۔ میں نے خورشید سے کہا کہ ''اگر ایک آدھ کمرہ اور بن جائے تو ذرا آسانی ہوجائے۔'' وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ہمیں شکر کرنا چاہئے کہ ہم کیمپ میں نہیں رہتے۔ملک کی آزادی کے لئے ہم نبرد آزما ہیں۔ پس کہاں زیب دیتا ہے کہ اپنے ذاتی آرام وآسائش کا سوچیں۔

میں ہمیشہ چپ ہو جاتی۔اس گھر میں مجبوراً دو کمرے اس وقت بنوانے پڑے۔ جب شیخ عبداللہ پنڈت نہرو کا ایک خاص پیغام لے کر کشمیر کے تصفیے کے لئے آزاد کشمیر آئے۔لیکن اس سے پہلے کے مذاکرات ہوتے یا گفت وشنید ہوتی۔ پنڈت نہرو کا دہلی میں اچانک انتقال ہوگیا اور شیخ عبداللہ واپس چلے گئے۔ان کی تقدیر میں نہیں تھا کہ وہ

اپنے ہم وطنوں کے لئے کچھ کرسکیں۔ ہندوؤں کے ساتھ تھے۔جیل کی صعوبتوں کے ساتھ انہوں نے بھارت کا وفادار رہنے کی وجہ سے کشمیر کی وزارت عظمیٰ کا عہدہ دیر تک سنبھالا۔ بے شمار مراعات بھی بھارت سے حاصل کی۔عیش وعشرت کی زندگی ان کے سارے خاندان نے گزاری۔لیکن اب اسی شیخ عبداللہ کی قبر پر حکومت پہرہ دیتی ہے۔ حکومت کو ڈر ہے کہ مشتعل عوام ان کی قبر کھود کر ان کی بے حرمتی کریں گے۔ پھر بھی لوگ وہاں غلاظت پھینکتے ہیں اور ہر طرح کی بددعائیں دیتے ہیں۔مرنے کے بعد بھی جس شخص کو لوگ لعن وطعن کریں۔وہ خدا کو کیا جواب دے گا؟ قوموں کے غداروں کا یہی حال ہوتا ہے۔ لوگ انہیں معاف نہیں کرتے۔سلطنت روما کی شکست۔سپین میں مسلمانوں کا زوال۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور دنیا میں بے شمار قوموں کے ایسے المیے کے ساتھ بے شمار غداروں کے نام بھی دنیا کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ جو غدار تھے اور جنہوں نے اپنوں کی حرمت پامال کی کشمیر کی خوبصورت گھاٹیاں پرنم ہیں وہاں کے بہتے ندی نالے جن میں جھرنوں کا ارتعاش ہے۔بے گناہ لوگوں کے خون سے بھر گئے ہیں۔وہاں کے سبزہ زار اداس ہیں۔وہاں کے معطر خوشرو پھولوں سے مظلوم اور محکوم لوگوں کے خون کی مہک آتی ہے۔ جہاں دوشیزائیں بھارت کی ہوش پرستی کا شکار ہوگئی ہیں جہاں کے معصوم بچے ماؤں کی لوری کی بجائے گولہ بارود کی آوازیں سنتے ہیں۔ جہاں نوجوان صبح گھر سے نکلتے ہیں تو شام کو ان کی لاشیں گھر آتی ہیں۔ جہاں نئی نویلی دلہن شوہر کے قرب اور محبت کے لئے طویل انتظار کرتی ہے۔ جہاں مائیں اپنے نوجوان بیٹوں کی سلامتی کے لئے دن رات دعائیں کرتی ہیں۔ جہاں عورتیں اپنے سہاگ کے تحفظ کے لئے کربناک اذیت سے گزرتی ہیں۔ جہاں زندگی میں جمود کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں وقت ٹھہر گیا ہے۔ جہاں تہذیب گنگ ہوگئی ہے۔ جہاں حسن سوگوار ہے۔ جہاں خوشیاں اورسکون لٹ گیا ہے۔ جہاں بربریت ہے۔ انسانیت

استادہ ہے اور دنیا خاموش تماشائی کی طرح یہ سب دیکھتی ہے اور ان کا ضمیر نہیں جاگتا۔

ہمالیہ کے دامن میں 84 ہزار مربع میل کی یہ خوبصورت ریاست جس کا حسن لازوال ہے گزشتہ 60 برس سے بھارت کے غاصبانہ قبضے میں ہے۔ برصغیر کی آزادی کے لئے جو یہ قانون برطانوی حکومت نے نافذ کیا تھا وہی ۵۶۰ ریاستوں پر بھی عائد ہوتا ہے لیکن مہاراجہ کشمیر کی ناعاقبت اندیشی اور بھارت کی عیاری کی وجہ سے ریاست کا بیشتر حصہ بھارت کے قبضے میں آگیا۔ تقسیم ہند کے بعد جب ملک میں فسادات کی آگ بھڑکی تو ریاست کشمیر میں پونچھ کے ایک حصے میں بغاوت ہوگئی۔ سابقہ فوجی ملازمین اور لوگوں نے مل کر مہاراجہ کے خلاف جہاد کا آغاز کیا جس میں صوبہ سرحد سے قبائلی پٹھانوں نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح آزاد کشمیر کا آزاد خطہ معرض وجود میں آیا۔ گلگت اور بلتستان بھی اس طرح مقامی لوگوں کی قید سے آزاد ہوئے۔ وہ علاقے بے شک اس وقت پاکستان کے شمالی صوبے کے ساتھ ہیں۔ بھارت کا حصہ نہیں تقریباً ۴ ہزار مربع میل کا علاقہ آزاد کشمیر ہے جو آزاد ہو جانے کی وجہ سے ریاست کشمیر کی نمائندہ حکومت کا درجہ رکھتا ہے۔

کشمیر پر بھارت کا قبضہ ایک ایسی نامکمل کہانی ہے۔ جسے مقبوضہ کشمیر کے لوگوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ بھارت کی پٹھو حکومتیں۔ نام نہاد اسمبلیاں اور برائے نام الیکشن لوگوں کو کبھی متاثر نہ کر سکے۔ اندر اندر ایک آگ سلگتی رہی۔ ظالم حکمرانوں کے خلاف۔ ناانصافیوں کے خلاف۔ تہذیب ثقافت اور مذہب کی بے حرمتی کے خلاف اور سب سے زیادہ اس غاصبانہ قبضے کے خلاف۔ جسے لوگوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بھارت نے

کشمیر کی 80 فیصدی مسلمان آبادی کو طاقت کے زور پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہا پھر مسلمانوں کو وہ حقوق بھی نہ دیئے۔ جس کے وہ حقدار تھے۔ اپنے ہی ملک میں ہندو کو ان پر ترجیح دی گئی۔ باہر سے لوگ کشمیر میں بھیجے گئے۔ عوام کو ہر لحاظ سے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ انہیں ہر طرح سے مٹانے اور پامال کرنے کی سوچی سمجھی سازش کی گئی۔

ظلم جب انتہا کو پہنچ جائے۔ تو اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ یہ تاریخ ہے اور تاریخ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر تاریخ خود کو دہراتی بھی ہے۔ چنانچہ اس ظلم بے انصافی اور طاقت کے زور سے ملک پر قبضہ کرنے کے خلاف کشمیر کا نوجوان گزشتہ کئی سال سے بھارت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اسے نہ اپنی جان کی پروا ہے۔ نہ گھر والوں کی سلامتی سے غرض ہے۔ بس ایک ہی جذبہ ہے اور وہ جذبہ حریت کا ہے۔ وہ ظالموں سے نبرد آزما ہے جو اس کی دھرتی پر زبردستی قابض ہو گئے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ تو ہمیشہ سسکیوں اور اشکوں سے وابستہ ہے۔ ہمیشہ غیر یہاں قابض رہے۔ حملہ آوران پر سکون گھاٹیوں پر تشدد کرتے رہے اور حکمرانی کرتے رہے۔ کشمیر کی پرانی تاریخ محفوظ ہے۔ پنڈت کالین کی مشہور تصنیف 'راج ترنگی' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کی سرزمین سے بھی بادشاہوں نے مل پر حکومت کی پھر اسلام کی روشنی سے جب ہمالیہ کے دامن میں گھرا ہوا یہ خوبصورت ملک منور ہوا تو ۷۰۰ سال تک کشمیری مسلمان بادشاہوں نے یہاں حکومت کی۔ لیکن آخری بادشاہ یوسف چک کو مغلوں نے شکست دے کر کشمیر کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ مغلوں کے بعد افغان۔ پھر سکھ۔ پھر ظالم ڈوگرے یہاں حکومت کرتے رہے۔ ڈوگروں نے ۱۸۴۶ء میں معاہدہ امرتسر کی رو سے کشمیریوں کو ٹکوں کے عوض انگریزوں سے خریدا۔ انگریز ہمیشہ مسلمانوں کا دشمن رہا ہے یا شاید

ساری دنیا میں یہ ایک سازش ہے کہ مسلمانوں کو مٹا دیا جائے۔

ڈوگروں کے آخری مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۹۴۷ء میں کشمیر کا عارضی الحاق بھارت سے کر دیا۔ جس کا کوئی جواز نہیں اور اسی سیاسی غلطی کی وجہ سے کشمیر اس وقت شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہے۔ بھارت ہر طرح مجاہدین کو کچلتا ہے۔ اُن پر ظلم کیا جاتا ہے۔ اُن کے گھر جلائے جاتے ہیں۔ ان کی خواتین کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ انتہائی انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے اور پھر ان کی لاشیں دریا میں بہا دی جاتی ہیں۔ نوجوان صبح گھر سے نکلتے ہیں۔ تو ان کی واپسی کی امید نہیں ہوتی۔ لیکن اس سارے ظلم اور تشدد کے باوجود آزادی کی شمع روشن ہے اور اس میں مردوں کے ساتھ کشمیر کی خواتین بھی اب شامل ہیں۔ جو پردے میں رہتی تھیں اور باہر کی دنیا میں کبھی مردوں کے ساتھ نہیں نکلیں۔ آزادی کی یہ گونج وادی کے پہاڑوں سے نکل کر سب جگہ اب سنائی دیتی ہے۔ آزادی جو ایک نعمت ہے۔ جس کے لئے شاعروں نے نظمیں لکھیں۔ قصیدے لکھے۔ اہل قلم نے اتنا لکھا کہ محکوم قومیں نیند میں بھی بیدار ہو گئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے ملک سے محبت' اپنی دھرتی سے محبت ایک بڑا ہی سحر انگیز جذبہ ہے۔ جس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ صدیوں سے محکوم کشمیر کا نوجوان اب جاگا ہے۔ اپنے حقوق کے لئے اپنی زمین کے تحفظ کے لئے۔ اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی حرمت کے لئے۔ اس نے صدیوں پرانی اس کہاوت کو بھی جھٹلا دیا ہے ''یہ تو ڈرپوک ہے'' پہاڑوں سے گھری ہوئی اس خوبصورت وادی کے لوگ ڈرپوک نہیں تھے بلکہ ان پرامن گھاٹیوں کے حسن میں سرشار تھے فنونِ لطیفہ سے مالا مال تھے۔ اپنی دستکاری۔ کڑھائی پیر ماشی لکڑی کے باریک کام اور ان سب خوبیوں سے مطمئن تھے۔ جو قدرت نے انہیں عطا کی تھی۔ پھر

اللہ نے انہیں لاجواب ذہانت سے نوازا جس کا اعراف صدیوں سے مورخین اور سیاحوں نے کیا۔ بارہویں صدی میں چین کے مشہور سیاح جو بدھ مت کی تبلیغ اور ریسرچ کے لئے کشمیر بھی آیا۔ نے لکھا کشمیری بہت ذہین قوم ہے اور اس کا اعتراف دوسرے یہاں آنے والے مورخین اور سیاحوں نے بھی کیا۔

لیکن گزشتہ تقریبا نصف صدی کے ناقابل برداشت مظالم اور کشمیر کی سرزمین پر زبردستی قبضے کا ردعمل اس طرح ہوا کہ سب حیران رہ گئے اس وقت کشمیر ایک جوالا مکھی ہے۔ جسے بھارتی قابض فوجیں سنبھالنے میں ناکام ہو گئی ہیں۔ روز مزید فوج بھارت سے کشمیر میں بھیجی جاتی ہے۔ اور وہ جب حالات پر قابو نہیں پا سکے تو لوگوں کو اذیت ناک سزائیں دیتے ہیں اور پھر انہیں بے آبرو کر کے ان کی لاشیں دریاؤں میں بہا دی جاتی ہیں۔ کشمیر کے صاف شفاف دریا جن میں جھرنوں کا ارتعاش ہے۔ اس وقت شہیدوں کے خون سے لبریز ہے۔

بھارت اس لئے بھی ظلم اور تشدد کرتا رہا ہے کہ کشمیر ایک آواز بن کر باہر کی دنیا میں نہ نکلے۔ حالانکہ گزشتہ ۶۰ برس سے کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کی اقوام متحدہ کی قراردادوں سے بھارت نے کشمیر میں رائے شماری کرانے کی قرارداد پر رضامندی کا اظہار کیا ہوا ہے۔ لیکن اتنے سالوں میں کچھ نہ ہو سکا۔ شروع میں جو وفد اس سلسلے میں آئے۔ وہ بھارت کی ہٹ دھرمی سے ناکام لوٹے۔ اور یہ مسئلہ لٹکا رہا۔ الجھا رہا۔ جب تک اپنے حقوق کے لئے انسان خود تگ و دو نہ کرے۔ انصاف نہیں ہوتا۔ دنیا میں اتنی افراتفری ہے۔ اتنی تیزی ہے کہ دوسروں کے لئے سوچنے کا کسی کے پاس وقت نہیں۔ جب تک آپ دوسروں کے ضمیر کو بیدار

کرنے کیلئے تگ ودو نہ کریں۔سب کچھ استادہ رہتا ہے۔

کشمیر کے مسئلے کیلئے مردوں کے وفود کئی بار باہر گئے۔ انہوں نے مظاہرے بھی کئے۔ دوسرے ملکوں کے نمائندوں سے بھی ملے لیکن لگتا ہے۔کوئی خاص طور پر اثر انداز نہ ہوسکے۔ نہ کسی کو متاثر کرسکے۔ نہ کسی کا ضمیر جھنجوڑ سکے۔ چنانچہ اس بار حکومت آزاد کشمیر نے خواتین کا ایک وفد یو این او کے انچاسویں اجلاس میں جنیوا اور پھر واشنگٹن اور امریکا بھیجنے کا سوچا اور مجھے بھی دعوت دی۔ میں بہت دن سوچتی رہی کہ مجھے جانا چاہئے یا اس دعوت کو مسترد کردینا چاہئے۔لیکن میرے اندر سے ایک عجیب سے جذبے نے مجھے جھنجوڑا تاکہ اپنے ملک کے لئے اس کی آواز اٹھانے کے لئے۔ اس ظلم کا سدباب کرنے کے لئے دوسری خواتین کے ساتھ مجھے بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ جو بحیثیت ایک کشمیری اور ایک محبّ وطن کے مجھ پر فرض بن جاتا ہے اور پھر میں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ دعوت مجھے ملی ہے۔حکومت کوئی بھی ہو۔ اس میں افراد اہم نہیں ہوتے۔ بلکہ ملک اور اس کا وقار اہم ہوتا ہے۔

چنانچہ عین وقت پر میں بھی وفد میں جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ وفد کی قیادت بیگم عطیہ عنایت اللہ نے کرنا تھی۔ جو ایک جانی پہچانی سماجی شخصیت ہیں اور بارہا ملک سے باہر جا چکی ہیں۔ تجربہ کار ہیں اور ملک اور قوم کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ کشمیر کبھی نہیں گئیں۔لیکن ان کے آباؤ اجداد وہیں سے آئے۔ ان لاکھوں کشمیری خاندانوں کی طرح جو وقتاً فوقتاً حالات کی وجہ سے اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں شاید اس لئے برصغیر کے سارے حصوں میں ایسے کشمیری آباد ہیں۔جنہوں نے اپنا ملک کبھی نہیں دیکھا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں بھی کشمیری رہتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں کبھی نہیں گئے

اور کئی پشتوں سے ان کے خاندان دنیا کے دوسرے ملکوں میں رہائش پذیر ہیں۔

وفد میں شریک دوسری خاتون مسز شیریں وحید تھیں جو اسمبلی کا رکن بھی رہ چکی ہیں اور وزارت کا عہدہ بھی ان کے پاس رہا ہے۔تیسری خاتون مسز شمیم شال تھیں۔ جو حال ہی میں مقبوضہ کشمیر سے آئی ہیں۔ وہاں کے ایک کالج میں پروفیسر تھیں۔مجاہدین کی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک تھیں۔ اور وہ روح فرسا واقعات کی چشم دید گواہ ہیں۔جس سے ریاست میں اس آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔کشمیر کونسل کی طرف سے مسٹر صدیق بھی ساتھ تھے۔ جو سارے سفر میں سب کے مددگار ثابت ہوئے ہمارے جنیوا پہنچنے پر لندن سے ڈاکٹر ایوب ٹھاکر بھی آگئے جو اس وقت برطانیہ میں انسانی حقوق کمیشن کے سربراہ ہیں اور کشمیر کی آزادی کے لئے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔اتفاق سے ہمارے مشہور جرنلسٹ شاہد حسین بھی جنیوا میں موجود تھے۔ جو یو این او کی کارکردگی کو پاکستان کے اخباروں کے لئے سمیٹنے کے لئے آئے تھے۔

......☆......☆......☆......

۲۷ فروری کو رات ۱۲/۳۰ بجے ہم سب اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے جنیوا کے لئے روانہ ہوئے۔ سردی اور نصف شب کا وقت لیکن خود میں مجھے ایسی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ جس کا سحر میرے وجود پر چھا گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا وطن کی ہوائیں مجھے سلام کہہ رہی ہیں اور ان شہیدوں کی روحیں مجھ سے اپنے حقوق کی پامالی کا شکوہ کر رہی ہیں۔ کچھ لمحوں کے لئے مجھے بہت اچھا لگا کہ آزادی کی اس خونی جنگ میں اپنا تھوڑا سا حصہ ڈال رہی ہوں یہ موقعہ میرے لئے انوکھا ہے۔ شاید اس طرح تحریک آزادی کشمیر کو خدا جلا بخشے اور بہت جلد ہمارا ملک بھارت کے ظالم تسلط سے آزاد ہو جائے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنے سب کے تحفظ‘ کامیابی اور ملک کی آزادی کے لئے دعا کی۔ ملک کی سرحدیں چھوڑتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم اپنے ملک سے باہر نہیں رہ سکتے۔ سالوں کے بعد پاکستان سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تھا...... اور پھر ایک خاص مقصد کے لئے۔ ایک خاص کام کے لئے ...... ہمارا جانا مسئلے کا حل تو نہیں۔ لیکن کم از کم کچھ پیش رفت تو ہے...... کسی مقصد کے لئے ایک اینٹ رکھنا بھی اہم ہوتا ہے۔

فلائٹ آرام دہ تھی۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی۔ لیکن سو نہ سکی۔ میں سفر میں سو نہیں سکتی۔ بس سوچتی رہی۔ خیالات کے تانے بانے میں الجھی رہی۔ کئی افسانوں کے پلاٹ ذہن میں گھومے۔ کئی مسائل کے متعلق سوچا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان خاتون بیٹھی تھیں جو حُلیئے اور شکل وصورت سے کوریا یا فلپائن کی لگتی تھیں۔ لیکن جب وہ اردو میں مجھ سے ہم کلام ہوئیں تو معلوم ہوا وہ لاہور کی رہنے والی ہیں۔ اور نیویارک میں رہتی ہیں۔ مشرقی اور مشرق وسطیٰ کے زیورات بنواتی ہیں اور امریکہ کے بڑے بڑے سٹورز کو فراہم کرتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ زیورات کے نمونے لے کر جاپان سے آ رہی تھیں...... پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس بیرونی پرواز پر بہت خلیق اور باتمیز ہوتی ہیں...... ملک کی پروازوں میں بسا اوقات وہ اس طرح نہیں ہوتیں انہوں نے بڑی خاطر تواضع کی۔ فرینک فورٹ کے ہوائی اڈے پر ہم ۸ گھنٹے کی پرواز کے بعد ۳ گھنٹے کیلئے رکے...... ہوائی اڈہ ایک شہر لگتا ہے۔ بہت بڑا ہے...... دنیا کے سارے ممالک سے ہر چند منٹ کے بعد جہاز آتے ہیں...... ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنا ایک طویل منزل طے کرنے کے برابر ہے...... ہم ایک جگہ بیٹھ گئے اور آنے جانے والوں کو دیکھتے رہے۔ دنیا کے ہر ملک اور قوم کے لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک فلائٹ سے کئی پاکستانی خاندان آئے جو روزگار کی تلاش میں اس شہر میں آباد ہیں۔ خواتین اور چھوٹے بچے جو اس مغربی ملک

میں بڑے ہوں گے اور ان قدروں سے بہت دور۔ جو مشرق کی تہذیب کا ایک حسن ہے۔ چینی‘ جاپانی اور کالے لوگ بھی تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ لگتا تھا۔ گورے لوگوں پر ان لوگوں نے سبقت لے لی ہے...... ایک ریسٹورنٹ میں ایک پاکستانی خاتون جس کا تعلق کراچی سے تھا۔ مہمان نوازی کے فرائض انجام دے رہی تھی...... وہ گزشتہ ۲۰ سال سے اپنے خاندان کے ساتھ فرینک فورٹ میں مقیم ہے...... اور میں اس

سے باتیں کر کے سوچنے لگی وہ دیارِ غیر میں روزی کے لئے آئی ہوئی ہے اور ہم دیارِ غیر میں وطن کے لئے آئے ہیں...... یہاں آ کر دوسری جنگ عظیم کے دل ہلا دینے والے واقعات بھی یاد آ گئے اور ہٹلر کی ساری زندگی ذہن میں تازہ ہو گئی...... کتنا سخت گیر آدمی تھا۔ جسے یورپ کو سیر کرنے اور جرمن کی ایک حکومت بنانے کا خبط سوار تھا اور اس جنون میں اس نے لاکھوں انسانوں کو بے موت مار دیا...... یہ لاکھوں کا قاتل اور بے گناہ انسانوں کا قاتل خود ایک گمنام موت مرا۔ جب جرمنی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا تو اپنے محل میں اس نے زیرِ زمین اپنی محبوبہ کے ساتھ خودکشی کر لی اور اپنے اے ڈی سی کو حکم پہلے سے دے دیا کہ جب وہ گولی کی آواز سنے۔ تو دونوں کی لاشوں کو تیل ڈال کر جلا دے تاکہ ان کی لاشیں اتحادیوں کے ہاتھ نہ لگیں۔ جو یقیناً انہیں چوراہے میں الٹا لٹکا دیتے۔ کیا ملک گیری کی ہوس انسان کو اتنا ظالم بنا دیتی ہے کہ انسانی قدریں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایسے ہی ہوتا ہے۔ پھر بھی لوگ سبق نہیں سیکھتے۔ اب بھارت نے بھی کشمیر میں یہی پالیسی اپنائی ہوئی ہے...... اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان کے ساتھ اس ظلم کا ردِعمل کیسا ہو گا۔

مغرب کے وقت کے مطابق جو پاکستان کے وقت سے ۴ گھنٹے پیچھے ہے۔ ہم ۳ بجے بخیریت جنیوا پہنچ گئے۔ ہوائی اڈہ پر یو این او کمیشن میں پاکستان کے سفیر مسٹر احمد کمال اور ہماری ایک خاتون کونسلر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ ہماری عورتیں اب ملک کی بیرونی سروس میں بھی ایک بھرپور رول ادا کر رہی ہیں...... اور یہ بڑی حوصلہ افزاء بات ہے۔ کیونکہ بسا اوقات وہ مردوں سے بھی اچھا کام کرتی ہیں...... عورت طبعاً منتظم ہے اور جب وہ گھر سے باہر کام کرتی ہے تو اسی جذبے سے کرتی ہے۔ جس طرح وہ گھر، شوہر اور بچے سنبھالتی ہے...... ہماری رہائش کے لئے کرسٹل ہوٹل میں بندوبست تھا...... چوتھی منزل پر ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے...... مختصر لیکن ضرورت کی ہر چیز موجود

تھی...... سامان رکھ کر ہم فوراً کمیشن گئے جہاں وہ سارا سامان جو تحریک آزادی کشمیر کے سلسلہ میں ساتھ لائے تھے اسے کھولا گیا اور الگ الگ کیا کشمیریوں پر مظالم کی داستان کتابچوں، تصویروں، کیسٹ اور ہر طرح سے...... اچھے طریقے سے بیان کی گئی تھی۔ واقعی محنت کی گئی تھی۔ ایسے جھنڈے بھی تیار کئے گئے تھے۔ جن پر بربریت کی داستانیں قلم تھیں۔ یہ جھنڈے نیویارک اور واشنگٹن میں یو این او اور دوسرے اہم جگہوں پر نصب کرنے کے لئے جنیوا میں بھی ایسا مظاہرہ کرنا تھا۔

ہوٹل میں کھانے کا بندوبست نہیں تھا۔ صرف ناشتہ دیتے تھے لیکن قریب ہی ریسٹورنٹ اور ہوٹل موجود تھے۔ ہم لوگ رات کے کھانے کے لئے ایک چینی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان کی طرح چینی ریسٹورنٹ کا کھانا ہو گا۔ لیکن بہت مایوسی ہوئی کھانا نہایت پھیکا بدمزہ اور بے تحاشہ مہنگا تھا۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد ہم یو این او کی اس عمارت میں گئے۔ جہاں انسانی حقوق کی پامالی کے سلسلہ میں دنیا کے ۶۵ ممالک شریک تھے اور اس سلسلے کا انچاسواں اجلاس اس سال ہو رہا تھا۔ ویسے تو ہر سال سارا سال کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس طرح کا بین الاقوامی اجتماع منفرد ہوتا ہے جہاں اپنے حقوق کی بحالی، انصاف کی بحالی اور اپنے تحفظ کے لئے پسے ہوئے ملک اور پسی ہوئی پسماندہ قومیں اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ادارے سے جینے کا حق مانگتی ہیں۔

کشمیر میں اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے سلسلے میں خواتین کی شرکت پہلی بار ہوئی۔ یو این او کے زیرِ اہتمام کانفرنس کے دوران صبح ایسی کارروائی ۱۰ بجے شروع ہوتی ہے۔ ۲ بجے ایک گھنٹے کیلئے وقفہ ہوتا ہے۔ پھر تین سے ۴ بجے تک لوگ کانفرنس سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد ے سے ۱۰ تک پھر کارروائی جاری رہتی ہے...... کانفرنس میں شریک ہونے کیلئے پاس جاری کئے جاتے ہیں۔ سیکورٹی سخت

ہے۔ کارڈ کے بغیر کوئی ہال میں داخل نہیں ہوسکتا...... اس بلند و بالا بلڈنگ میں دنیا کے مختلف ملکوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں۔ ہال جہاں کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ اونچی چھت کے ساتھ گولائی میں بنا ہوا ہے۔ لمبی اور طویل راہدریاں ہیں ان کے ساتھ ایک کھلا کمرہ ہے۔ جس مین لمبے لمبے شیشے کے دروازے ہیں۔ جہاں سے باہر کا نظارہ دیدہ زیب لگتا ہے۔ سرسبز گھاس کی روشیں۔ بلند درخت اور دور سے سوئٹزرلینڈ کے اونچے اور سربفلک پہاڑ۔ جو برف سے ڈھکے ہوئے ہیں...... جنیوا میں اس وقت سردی بہت تھی۔ درجہ حرارت زیرو سے نیچے تھا۔

جنیوا میں ہم نے چار روز اس اجلاس میں شرکت کی۔ جس میں افریقہ، جنوری امریکہ، چین، جاپان اور دوسرے تمام ممالک نے یواین اے کے چیئر مین کو اپنے وہ مطالبات بتائے۔ جن سے ان کے ملک دوچار ہیں...... ہر مندوب کو بولنے کیلئے دس منٹ دیئے جاتے ہیں...... ان پر سوال بھی ہوتے ہیں۔ تقریر کے بعد بولنے والا اپنی تقریر کی کاپیاں لوگوں میں بانٹتا ہے۔ ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ نے بڑے موثر انداز میں بھارت کے عزائم کو بے نقاب کیا۔ ان کے مظالم یواین او کی قراردادوں کی بے حرمتی اور کشمیر کے متعلق ان زیادتیوں کا بھی ذکر کیا۔ جو اب تک اس مسئلے کو الجھائے ہوئے ہیں۔ ان کی تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔ اور بعد میں ہم جب دوسرے وفود سے ملے۔ تو معلوم ہوا کہ کشمیر کے حالات مغربی دنیا سے پوشیدہ ہیں۔ بھارت کا پروپیگنڈا اتنا زیادہ ہے اور وہ گزشتہ کئی سالوں سے جھوٹ بول رہا ہے پھر ایک مشن کے طور پر انہوں نے کشمیر کے متعلق مغربی دنیا میں یہ تاثر دیا ہے کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان خواہ مخواہ مداخلت سے حالات کو خراب کرتا ہے اور اب مجاہدین کی کارروائیاں اور کشمیر میں آزادی کی جنگ کو بھی وہ پاکستان کے ساتھ ملوث کرتا ہے۔

شمیم شال صاحبہ جو حال ہی میں کشمیر سے آئی ہیں۔ وہاں عورتوں کی بے حرمتی کے

متعلق چشم دید واقعات اور حالات بیان کئے۔ جو چونکا دینے والے تھے۔ مشاہد حسین نے اپنی تقریر میں بھارت کے جھوٹے پروپیگنڈے اور کشمیر میں ان کی ہٹ دھرمی اور غلط سوچ کے متعلق حقائق بتائے۔ بھارت کا نمائندہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان کشمیر کے اندرونی معاملات میں دخل دیتا ہے میں اور شیریں وحید باروم میں بے شمار لوگوں سے ملیں۔ جس میں جنوبی امریکہ، چین ، بھارت اور یورپ کے دوسرے ممالک، افریقہ کے کئی ملک اور پسماندہ ملکوں کے نمائندے شامل تھے۔ کچھ تو کشمیر کے متعلق صرف اتنا جانتے تھے کہ کشمیر کی اون بڑی اچھی ہوتی ہے۔ کچھ کو یہ معلوم تھا کہ وہ خوبصورت ملک ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ وہ افغانستان کا حصہ ہے۔ چند کو صرف یہ پتہ تھا کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اور آپس میں کوئی سرحدی جھگڑا چل رہا ہے۔ اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کشمیر کے معاملے میں بھارت کے ساتھ دخل اندازی کر رہا ہے...... ہم نے سب کو حقیقت بیان کی۔ وہ پمفلٹ دیئے جو ساتھ لائے تھے۔ شاید ہم سے یہی غلطی ہوئی ہے...... ہمارے سفارت خانوں سے غلطی ہوئی ہے کہ ہم نے دنیا کو بھارت کے عزائم بھارت کی نیت سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ غاصب ہیں، زبردستی کشمیر پر قابض ہیں...... فوج کے بل بوتے پر غریب کشمیریوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ پھر بھی خود کو بے قصور سمجھتے ہیں...... اور دنیا کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ پاکستان کشمیر کے سلسلے میں بھارت سے خواہ مخواہ الجھ رہا ہے۔

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور سچ کو آنچ نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے لئے ایک موقف ایک لائحہ عمل ہونا چاہئے۔ اس طرح اپنے حقوق کی حفاظت ہوسکتی ہے۔ جنیوا کانفرنس میں مجھے یہ بھی احساس ہوا۔ کہ کشمیر کے حصول کے لئے ہمیں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے...... اور کئی پلیٹ فارم پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے کارکردگی کی وجہ سے بھارت کا وفد بہت بوکھلایا اور پریشان ہوا۔ ہماری آمد کے چوتھے روز یو این او کی وسیع وعریض بلڈنگ اور احاطے میں بے شمار بھارتی مرد اور عورتیں نظر آرہے تھے۔ جو بھارتی ویسے ہی جنیوا میں مقیم ہیں۔ ان سب کو ان لوگوں نے مدعو کر لیا تھا یو این او کے اجلاس کے علاوہ ہم انٹرنیشنل ریڈ کراس کے سربراہ سے بھی ملے۔ جن کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں موجود ہے۔ انہیں کشمیر میں زخمی اور بیمار لوگوں کے متعلق بتایا۔ جنہیں دوائیاں میسر نہیں اور علاج و معالجے کی سہولت ان حالات میں حاصل نہیں...... سربراہ نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اس سلسلہ میں دوائیاں اور ڈاکٹر مقبوضہ کشمیر میں بھیجیں گے...... انٹرنیشنل جورسٹ کانفرنس کے سربراہ سے بھی ملے۔ اس نے بھی کشمیر کے سارے حالات سنے۔ اس کا ایک وفد حال ہی میں مقبوضہ کشمیر جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ نے انہیں آزاد کشمیر آنے کی دعوت بھی دی تا کہ وہ دونوں ملکوں کے حالات کا اندازہ کر سکیں۔ سربراہ کو وہ کتاب بھی پیش کی جو کشمیر کے جج ہائی کورٹ جسٹس بہاؤالدین کی وہ رٹ ہے جو انہوں نے بھارت کی پارلیمنٹ میں کشمیریوں پر مظالم کے متعلق دائر کی ہے اور جسے حال ہی میں مشہور صحافی خالد حسن نے کتاب کی شکل دی ہے۔ وکلاء کے لئے اس سے بہتر ثبوت کشمیریوں پر مظالم کا کیا ہو سکتا ہے۔

ایک روز بعد دوپہر تین گھنٹے تک ہم نے اس چوراہے پر کشمیر پر ڈھائے جانے والے مظالم کے بینر لٹکائے جہاں مظاہرہ کرنے کی اجازت ہے۔ آنے جانے والے کو پوسٹر دیتے۔ گاڑیاں اشارے پر رکتی تھیں انہیں بھی پوسٹر دیتے۔ سردی اس روز بہت سخت تھی۔ ہوا بھی چل رہی تھی...... فوزیہ عباس کمیشن میں ہماری کونسلر نے چائے اور کافی کے تھرماس بنا کر بھیجے تھے۔ ساتھ ہی ٹرانسسٹر پر وہ کیسٹ بھی ہم نے لگا رکھی تھی جو کشمیر گانوں کا انگریزی ترجمے کے ساتھ تیار کروائی گئی تھی موسیقی کشمیر دھنوں میں تھی اور کانوں میں رس گھول رہی تھی...... ایک دن بعد دوپہر ہم جنیوا کی یونیورسٹی میں بھی

گئے۔ جہاں فرانسیسی میں لکھے ہوئے پمفلٹ طلباء میں تقسیم کئے۔ ان میں کشمیر کی جدوجہد کا ذکر تھا اور بھارتی مظالم کا تذکرہ...... چند طلباء نے خاصی دلچسپی لی جو انگریزی بول سکتے تھے۔ انہوں نے مسئلہ سمجھا اور وعدہ کیا کہ وہ دوسرے طلباء کو بھی بتائیں گے۔ نوجوان طبقہ کسی بھی ملک میں بہت اہم ہوتا ہے۔ ان میں کچھ کرنے کی ہمت بھی ہوتی ہے اور جذبہ بھی...... یہ ضرورت ہے کہ نوجوان نسل تک ایسے پیغام پہنچائے جائیں...... جن کی شنوائی مقصود ہو...... ڈاکٹر صاحب نے ریڈیو جنیوا کو بھی کشمیر کے سلسلے میں ایک انٹرویو دیا۔ جس میں تحریک آزادی کشمیر اور کشمیریوں پر مظالم کے متعلق سنایا...... کشمیر کے سلسلے میں جو سامان ساتھ تھا۔ اس میں ایسی چیزیں بھی تھیں جن پر کشمیری مہاجر کیمپوں میں مقیم مظفر آباد میں خواتین نے کام کیا تھا اور ساتھ ان کی طرف سے مہذب دنیا کے نام بھارتی مظالم کے ذکر سے مدد کی اپیل تھی۔ اس کے علاوہ دوستی کے بندھن' بھی باز و بند کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ جن پر مظالم کا ذکر تھا۔ یہ دونوں چیزیں وہاں دیں جن کا خاصا اثر ہوا اور لوگ بہت متاثر ہوئے۔

ہمارے ہاں کمیشن کے سارے عملے کا رویہ ہم سب سے بڑا اچھا تھا۔ سب نے بہت خیال رکھا۔ بہت عزت کی۔ بہت مدد کی۔ ایک رات سفیر صاحب نے کھانے پر مدعو کیا...... ایک دن فوزیہ عباس صاحبہ نے دوپہر کے کھانے پر بلایا...... پھر ہمارے یو این او میں متعین ایک صاحب مسٹر انور بٹ جن کا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور وہ کشمیری ہیں۔ رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ اور ان کی بیگم دونوں بہت ہی مہمان نواز اور مخلص تھے۔

جنیوا میں مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ سوائے کام کے کہیں جانے کے لئے وقت نہ ملا۔ آتے جاتے جنیوا کی بعض جگہیں دیکھیں۔ اس شہر میں ایک خوبصورت جھیل ہے۔ جو سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں سے آتی ہے اور تقریباً ۱۲۰ کلومیٹر لمبی ہے۔ اس کا نام راسگا

جھیل ہے۔

شہر کے ایک طرف گزرتی ہے اور بڑی خوبصورت لگتی ہے۔ شمال کی طرف ایک دریا بھی بہتا ہے۔ جنیوا میں کئی پارک ہیں۔ چرچ ہیں جن میں بعض بہت پرانے بھی ہیں۔ ایک مسجد بھی ہے۔ جو شاہ فہد نے پرانی مسجد کے ساتھ تعمیر کی ہے۔ یہاں تقریباً ۱۰۰ گھر مسلمانوں کے ہیں جو یہاں کاروبار اور ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں...... سب جمعہ کی نماز کے لئے ضرور آتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

جنیوا کا پرانا شہر بہت خوبصورت ہے۔ حکومت پرانے گھروں میں کسی طرح کی تبدیلی کی اجازت نہیں دیتی...... خاص طور پر باہر سے تاکہ پرانی تعمیر قائم رہے۔ یہاں پرانے اور بڑے وِلا بھی ہیں۔ جن کے ساتھ بڑے بڑے باغات ہیں۔ زیادہ تر یہ وِلا اب عربوں کے پاس ہیں جو یہاں موسم گرما گزارتے ہیں۔ جو جھیل کے ساتھ ہیں۔ وہ بہت مہنگے ہیں۔ سڑکیں چوڑی اور صاف شفاف ہیں۔ پرانے گھروں کے اوپر شیروں اور دوسرے جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بعض عمارات پر انسانی مجسمے بھی بنے ہوئے ہیں جو صرف خوبصورتی کے لئے تراشے گئے ہیں...... ایک چیز یہاں منفرد لگی کہ جھیل کے کنارے اور شہر کی مین سڑک کے کنارے ایک خاص قسم کا درخت بڑی ترتیب سے لگا ہوا ہے۔ اس وقت سردی کی وجہ سے صرف ان کی شاخیں اور تنے تھے۔ جو نہایت اچھی طرح تراشے گئے تھے۔ ایک ہی طرح کی اونچائی اور ایک ہی طرح کی ساخت بہار اور گرمی میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ درخت سرسبز نوخیز پتوں سے لد جاتے ہیں اور بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

اس وقت سردی کی وجہ سے جنیوا میں سیاح نہیں تھے۔ زیادہ تر وہاں کے مقامی لوگ تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تر سگریٹ نوشی کرتے نظر آئے...... رات دیر تک بھی بسا اوقات نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شدید سردی کے باوجود اپنی دنیا میں

مست گھومتے تھے...... دکانیں مال سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن ہر چیز بے تحاشہ مہنگی۔ سوئٹزرلینڈ دنیا کا بہت امیر ملک ہے۔ شاید اس لئے بہت مہنگا ہے۔ بہت اعلیٰ گھڑیاں بنتی ہیں۔ کھانا پینا اور دوسری ضروریات زندگی بھی گراں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی آمدنی بھی زیادہ ہے۔ شائد انہیں مہنگائی زیادہ نہ لگتی ہو۔ لیکن باہر سے جانے والے لوگوں کو بہت محسوس ہوتی ہے۔

جنیوا میں سوائے ان بڑے دلا کے جو بہت امیر لوگوں کی ملکیت ہیں۔ سارے فلیٹ ایک سے ہیں۔ ایک ہی طرز تعمیر اور ایک سا ہی تقریباً سائز ہر فلیٹ کے باہر ایک چھوٹی سی بالکونی ہے۔ جس میں گملے اور پودے رکھے ہوتے ہیں وہیں تار پر سوکھنے کے لئے ہر فلیٹ میں کپڑے لٹکتے ہیں...... ایک بلڈنگ میں کئی کئی ایسے فلیٹ ہیں...... لفٹ سے لوگ آتے جاتے ہیں اور مشین کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ شاید ایک دوسرے کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہیں۔ ویک اینڈ کو اپنے کام شاپنگ اور گھر کی صفائی کرتے ہیں...... ایک رات ہوٹل کے پاس ہی ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا تو اچھا لگا۔ اس لئے کہ مالک بھی اس کا پاکستانی تھا اور بیرا بھی گجرات کا رہنے والا تھا جو گزشتہ دس سال سے جنیوا میں مقیم ہے۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ کھانے کے بعد ہم چائے ضرور پئیں۔ جس کا وہ بل نہیں لے گا۔ پاکستانی مہمان نوازی دیارِ غیر میں بھی ان ہی روایات سے موجود ہے۔

جنیوا میں پانچ دن کے قیام کے بعد خواتین کے وفد سے میرا ساتھ ختم ہو گیا۔ وہ لوگ پندرہ روز کے لئے واشنگٹن اور نیویارک گئے میں نے ایک نجی قیام کے لئے کچھ دنوں کے لئے (اٹلی) جانے کا پروگرام بنایا۔ جہاں ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں اور ہمیشہ جب پاکستان آتے ہیں۔ وہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ عام حالات میں تو یہاں آنا شاید کبھی ممکن نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ جنیوا تک آنے

کا موقعہ مل گیا تھا۔اس لئے اٹلی جانا آسان تھا۔ مجھے ہمیشہ جنوبی اٹلی دیکھنے کا شوق تھا۔ اٹلی رومن بادشاہت کی آماجگاہ ہے۔ان پرانی قدروں' پرانی تاریخ' پرانے محلات اور پرانی یادگاروں کے ساتھ ماضی کے مدفن رازوں اور دلآویز حسن کے ساتھ ایک ایسا دلچسپ اور انوکھا ملک ہے جو سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔

جنیوا کو الوداع کہتے ہوئے مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوا۔صرف اس لئے کہ ہمارا یہاں مختصر قیام رائیگاں نہیں گیا۔ اپنے ملک جس کی سرحدیں اس وقت غیر محفوظ ہیں۔ جہاں رہنے والے ہمارے بدقسمت لیکن بہادر ہم وطن غیروں سے نبرد آزما ہیں۔ روز ایسی صبحیں طلوع ہوتی ہیں کہ وہاں کسی کو یقین نہیں آتا کہ کیا ان کی زندگی میں آج کی شام بھی آئے گی؟ بھارتی درندے' بھارتی فوج' بھارتی سیکورٹی فورس اور مقبوضہ کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت ان کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے۔ جسے وہ اب کسی قیمت پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں...... پرسکون وادیوں کا رہنے والا پرسکون کشمیر جو حسن سے لبریز ہے۔ حسن سے محبت کرتا ہے اور حسن سے سرشار اپنی زندگی میں مگن ہے۔ اس وقت ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ گیا ہے۔ جسے اب دنیا کی کوئی طاقت اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد سے روک نہیں سکتی۔

اپنے مظلوم لوگوں کے حقوق کی بحالی کے لئے ہم خواتین نے جنیوا میں دنیا کے ضمیر کو جھنجوڑا۔ یہ کوشش کافی نہیں ہے۔لیکن یہ کوشش کم بھی نہیں......اس لئے کہ بقول ایک مفکر کے۔

''جب چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے تو ماچس کی ایک تیلی جلانے سے ظلمت میں روشنی ہو جاتی ہے''

ہمارا یہ مختصر سا دورہ' اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں...... اندھیرے میں ماچس کی ایک تیلی جلانے کی طرح تھا۔

لیکن کچھ پیش رفت تو ہوئی!

اٹلی میں ساتویں صدی کے آخر تک چرچ کا سکون مذہبی جنگوں' کی وجہ سے متاثر ہوا اور اس طرح کے حالات پیدا ہوئے کہ روم کی عظیم سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔تاریخ دان اس المیے کے پہلو ڈھونڈنے کی سعی کرتے رہے کہ آخر یہ زوال' اس طرح اور اتنی سرعت سے کیسے ہوا؟ اور مذہب کے علاوہ اور کیا وجوہ تھیں جس سے روم کی وسیع سلطنت جس کی سرحدیں یورپ کے ساحلوں سے سپین کے ساحلوں تک اور شمالی افریقہ کے ملکوں حبشہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یوں ٹکڑوں میں بدل کر دنیا کے نقشے سے غائب ہو گئی۔ رومن تہذیب دنیا کی اولین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے اور صدیاں گزر جانے پر بھی علم وفنون' آرٹ سنگتراشی' مصوری اور دیگر باتوں میں لاجواب سمجھی جاتی ہے۔جس طرح روم کے عظیم حکمرانوں نے دنیا کو فتح کیا۔ دنیا کو تسخیر کیا۔ ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ فاتح کی حیثیت سے نامور ہوئے۔اور عدل وانصاف کے قانون نافذ کئے۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ ایسی تہذیب ایسی مملکت زوال پذیر ہو جائے گی۔لیکن یہ تاریخ ہے اور تاریخ ہمیں سبق سکھاتی ہے۔جسے ہم نہیں سیکھتے۔

......☆......☆......☆......

پاکستان میں تنگی وقت کی وجہ سے مجھے اٹلی کا ویزا نہ مل سکا۔لیکن جنیوا آ کر ہمارے ہائی کمشنر کی مہربانی سے مجھے اٹلی کا ویزا مل گیا۔

۵ مارچ کو صبح دس بجے میں جنیوا میں اٹلی کی لوکل فلائٹ سے روانہ ہوئی۔میلان دو گھنٹے کی مسافت کے بعد جہاز رکا۔ جہاں تین گھنٹے مزید جہاز رکا۔سب اٹلی کے رہنے والے لوگ تھے۔ انگریزی کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میلان اٹلی کا صنعتی شہر ہے۔اور بھارتی مشینری یہاں تیار ہوتی ہے۔ بہت مہنگا شہر ہے۔جنیوا سے میلان تک فلائٹ میں اٹلی کے سربفلک پہاڑ نظر آتے رہے۔جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں بعض جگہ پہاڑ چھوٹے بھی تھے۔لیکن برف ان پر بھی تھی۔شمال میں سسلی کا علاقہ ہے۔ جو بہت سرد ہے۔سسلی سے فرانس کا مردمجاہد نپولین بونا پارٹ یاد آجاتا ہے...... جو ایک عام گھر میں پیدا ہوا فوج میں معمولی عہدے پر فائز ہوا......اور اپنی خداداد قابلیت اور ہمت سے فرانس کا شہنشاہ بن گیا...... طاقت کا نشہ شائد اسے راس نہ آیا۔ اس سے غلطیاں بھی ہوئیں۔اتحادیوں کو شکست دے کر فرانس اور اٹلی کو ایک عظیم مملکت اس

نے ضرور بنایا۔لیکن ملک گیری کی ہوس سے توازن قائم نہ رکھ سکا...... انگریزوں نے اسے قید کرلیا......اور بحیرہ روم کے ایک چھوٹے سے جزیرے سینٹ ہلینا میں آٹھ سال کی قید تنہائی کے بعد گمنام موت مر گیا۔ جاہ وحشمت ملک گیری کی محبت بسا اوقات انسان کو گمراہ کر دیتی ہے اور طاقت کا نشہ بھی گمراہ کر دیتا ہے۔لیکن لوگ سبق نہیں سیکھتے۔ حالانکہ تاریخ میں تو انسان کے لئے بہت سبق ہیں...... سسلی کے ذکر سے وہاں کے سرخ مالٹے بھی یاد آتے ہیں۔ جو اتنے گہرے سرخ ہیں...... کہ کالے محسوس ہوتے ہیں۔امریکہ کے وسیع ملک میں سسلی کے مالٹے بھیجے جاتے ہیں۔ٹھنڈا ملک ہے اور شمال میں ہونے کی وجہ سے بہت ہی سردی پڑتی ہے۔فلورنس اور وینس کے شہر اٹلی کے جنوب میں ہیں۔ یہ سارا علاقہ انگور کے لئے بہت مشہور ہے۔ نہایت عمدہ انگور اور انگور کی شراب تیار ہوتی ہے۔

میں چار بجے بعد دوپہر کیپری پہنچی۔ میرے میزبان مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ ہوائی اڈہ شہر سے باہر ہے۔اس شہر کے دو حصے ہیں۔ایک سطح سمندر کے ساتھ اور دوسرا اس سے اوپر واقع ہے۔اس لئے شہر اتار اور چڑھاؤ میں بنا ہوا نظر آتا ہے۔سمندر میں بے شمار چھوٹے بڑے جہاز موجود ہیں۔ جو اٹلی کے شہروں کے علاوہ یورپ اور افریقہ کے ملکوں میں بھی جاتے آتے ہیں۔افریقہ کے ملکوں میں تیونس' لیبیا اور الجزائر اٹلی کے قریب ہیں۔تجارت ان ملکوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ مالٹا کا جزیرہ بھی نزدیک ہے۔ سڑکیں چوڑی اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں...... کالا پتھر اور سفید پتھر دونوں استعمال ہوا ہے۔ بعض جگہ اونچی نیچی پتھر کی ڈھلیاں ہیں۔بالکل ہمارے ملک کے کئی حصوں کی طرح...... زیادہ لوگ فلیٹوں میں رہتے ہیں۔ایک بلڈنگ میں کئی کئی فلیٹ ہیں...... پرانے فلیٹ بڑے اور کھلے ہیں۔ نئے فلیٹ چھوٹے اور تنگ ہیں...... ہر فلیٹ کے باہر چھوٹی سی

بالکونی ہے۔جس میں گملے نظر آتے ہیں ......ساتھ کپڑے سوکھنے کے لئے لٹکے نظر آتے ہیں ...... پرانے اور بڑے وِلا بھی ہیں۔جن کے ساتھ بڑے بڑے باغ بھی ہیں۔بعض چھوٹے گھروں میں بھی باغ ہیں۔جن میں سنگترے اور لیموں کے درخت پھل سے لدھے ہوئے ہیں ...... مالٹے، سنگترے اور زرد لیموں جو سائز میں ہمارے لیموں سے بہت بڑے ہیں ...... درختوں پر لٹکے ہوئے بڑے دیدہ زیب لگتے ہیں ......جن گھروں میں لان ہیں ...... وہاں پام اور کھجور کا درخت بہت ہے۔کھجور درختوں پر لگتی ہے۔لیکن اچھی قسم کی نہیں اگتی اس لئے کھانے کے استعمال میں نہیں آتی۔سرو، ربڑ پلانٹ، چیڑ کے درخت بھی بہت ہیں۔بعض سڑکوں پر اونچے سرسبز درختوں کی قطاریں دونوں طرف لگی ہوئی ہیں ......کئی گھروں میں سبزی کے تختے بھی نظر آتے ہیں ......سرسوں کا ساگ بالکل پاکستان کی طرح پیدا ہوتا ہے ...... ہمارے ملک کی طرح کی ساری سبزیاں بحیرہ روم کے اس ملک میں پیدا ہوتی ہیں اور نہایت ذائقہ دار ہیں ......اٹلی کا ٹائر بہت مشہور ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی جاتا ہے۔اور سارے اٹلی میں زیتون اور انگور بہت پیدا ہوتا ہے۔باہر کے ملکوں سے زرمبادلہ لانے کا موجب بھی ہے۔یہ فصل ستمبر اکتوبر میں ہوتی ہے۔کہتے ہیں انگوروں کی بیلیں انگور کے خوشوں سے لد جاتی ہیں اور زمین بوس ہو جاتی ہیں۔انگور کی شراب اٹلی میں بہت بنتی ہے اور انگور باہر بھی جاتا ہے۔لیموں بھی باہر جاتا ہے۔زیتون کے درخت کے متعلق یہ بات بڑی عجیب ہے کہ زیتون کا درخت ساٹھ سال کی عمر کا ہو کر پھل دیتا ہے۔زیتون کا پھل چھوٹا ہوتا ہے۔اسے درختوں سے اتارنے میں بڑی محنت لگتی ہے۔سمندر میں مچھلی بھی بہت ہے۔مقامی ضرورت کے علاوہ باہر بھی جاتی ہے۔

ایک دن صبح میں اپنے میزبانوں کے ساتھ کیپری دیکھنے گئی پرانا تاریخی شہر ہے۔

پرانے وقتوں میں رومیوں کی مملکت بھی رہا ہے۔اس لئے یہاں پرانے رومی بادشاہوں کی کافی نشانیاں نظر آتی ہیں۔اس شہر کی بنیاد ۶۰۰ مسیح قبل رکھی گئی۔یونانی تاجروں نے اس شہر کو آباد کیا۔یہاں یونانی تہذیب وتمدن اور تاریخ کے اُتار صدیوں تک قائم رہے تقریباً ۳۲۰ء میں رومنز نے یہاں قبضہ کر لیا۔رومن بادشاہوں کو بحیرہ روم کے کنارے یہ زرخیز شہر اتنا پسند آیا کہ وہ گرمی کا زیادہ وقت یہاں گزارنے لگے۔ ان کے بعد کئی حکومتیں یہاں آئی اور گئیں۔تقریبا ۱۵۰۳ء میں یہاں سپین نے قبضہ کر لیا۔اور سسلی ایک صوبہ بن گئے اور سپین کی سلطنت کا ایک حصہ بھی ......کئی صدیوں کے بعد تاریخ کے مختلف دور دیکھنے کے بعد اٹلی کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔اس دور کے چرچ آرٹ گیلریاں، گلیاں، محلات، پرانی عمارات اور تاریخی کتبے اس شہر کی تاریخ خود بیان کرتے ہیں۔

پرانے بادشاہوں کا ایک قلعہ جو تیرہویں صدی میں بنا تاریخ کے سارے خزانے اور داستان کے ساتھ سنگ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔مختلف دور کے مختلف ماہرین سنگ تراشی نے اپنے فن کا مظاہرہ یہاں کیا ہے۔پتھر کی چوڑی دیوار ...... چھوٹے پتھر کی گلیاں اور قلعے کی ساخت سے ان بادشاہوں کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔جنہوں نے یہاں طویل صدیوں تک رہائش اختیار کی اور اس شہر میں حکومت کی۔

بحیرہ روم کے کنارے مچھیروں کی آبادی کے ساتھ بھی ایک قلعہ بنا ہوا ہے جو ایک بہت بڑے رومن وِلا کے اوپر بنا اور شہر کی تاریخ کے کئی واقعات اس کے ساتھ ایک داستان ہیں۔

شاہی محل جو ۱۲۰۰ء میں بنا۔سب سے پہلے تو وائسرائے وقت کی رہائش گاہ کے طور پر انتخاب ہوا۔پھر ان تمام خاندانوں کی سرکاری رہائش گاہ بن گیا۔جنہوں نے

اس شہر پر حکومت کی۔ آٹھ سربراہ مملکت کے پتھر کے بنے ہوئے مجسمے یہاں اس حقیقت کی یاد دلاتے ہیں کہ ان خاندانوں نے یہاں حکومت کی۔ یہ سب انسان کو دنیا کی بے ثباتی کا اِس طرح احساس دلواتا ہے۔ دنیا صدیوں سے قائم ہے اور صدیوں سے لوگ حکومت کرتے آئے ہیں۔ لیکن یہ دیرپا نہیں۔ پھر بھی ہم سبق نہیں سیکھتے۔

کیپری کی سب سے بڑی پبلک لائبریری اب اسی محل میں قائم ہے۔

شہر کے تقریباً نصف میں کئی پرانے چرچ ہیں۔ جو مختلف وقتوں میں مختلف بادشاہوں نے بنوائے۔ بعض تو بہت پرانے ہیں۔ صدیوں پرانے۔ لیکن آباد ہیں۔ موٹے پتھر کی دیواریں اور محرابیں جن کی ساخت برصغیر کی عمارتوں سے بھی ملتی ہے۔ تاریخ کا بہترین نمونہ ہیں۔

کیپری کا عجائب گھر بہت نایاب چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ عمارت 1585ء میں بنی۔ شروع میں یہ عمارت فوج کی رہائش کے لئے استعمال ہوئی۔ پھر یونیورسٹی بنی۔ پھر عجائب گھر میں تبدیل ہوئی۔ ہر دور کے سنگ تراشی کے نمونے۔ مصوری کے شاہکار، زیورات مجسمے، پومپائی کے شہر سے نکلی ہوئی بے شمار چیزیں اس عجائب گھر کی زینت ہیں۔

تیرہویں صدی کی ایک خوبصورت عمارت جسے انیسویں صدی میں چند تبدیلیوں کے ساتھ ایک قلعہ کی شکل دی گئی۔ اس میں لکڑی کا لاجواب کام ہے لکڑی کا باریک کام دیکھ کر پرانے کشمیری کاریگروں کا خیال آ گیا۔ جو اس طرح لکڑی کا خوبصورت کام کرتے تھے۔ اور اب بھی وہ فن کشمیر میں قائم ہے۔ اس طرح گہرے براؤن لکڑی کے چکور تختوں پر باریک حاشیہ آرائی۔ لگا میں کشمیر کی کسی پرانی بلڈنگ میں کھڑی ہوں۔
شروع میں عیسائیت کی وہ جگہیں، قبریں اور نشست گاہیں بھی موجود ہیں۔ جہاں

لوگ بیٹھتے تھے اور آئندہ کے پروگرام بناتے تھے۔ یہاں وہ پرانی مصوری بھی موجود ہے۔ جو دیواروں پر بنائی جاتی تھی اور میوزیم بھی ہیں جن میں مختلف دور کی مختلف چیزیں نہایت قرینے سے رکھی ہوئی ہیں۔

اٹلی کے پرانے وِلا بہت خوبصورت ہیں جو امیر لوگوں کی ملکیت تھے اور اب بھی ہیں۔ ایک وِلا جو بہت ہی خوبصورت ہے۔ وہ روایات کے مطابق ۱۸۲۶ء میں بنا۔ یہ آرٹ کا نمونہ ہے۔ چینی مصوری کے نمونے دیدہ زیب ہیں۔ چینی کے خوبصورت برتن، چاندی کا سامان، لکڑی کے بہترین نمونے، پرانے فرنیچر کا حسن، سب عہد رفتہ کی باتیں لگتی ہیں اور موجود ہیں...... زیادہ پرانے وِلا چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں لیکن جو موجود ہیں۔ وہ مغرب کی دنیا میں بھی پرانی تمام عیش وعشرت کے ساتھ موجود ہیں۔ بڑے بڑے باغ ہیں...... جن کی تراش خراش نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ چیل کے بلند وبالا درخت بہت ہیں...... زیادہ سردی کا موسم گوگزر گیا ہے۔ لیکن اس کا اثر ہے۔ اس لئے پھول کم ہیں۔ سبزہ بہت ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ بہار اور گرمیوں میں پھولوں کی یہاں بھرمار ہوتی ہے۔ فضا میں مہک ہوتی ہے اور لالہ زار کا احساس ہوتا ہے چاروں طرف۔

پرانے کیپری کے شہر میں گلیاں تنگ ہیں۔ گاڑی نہیں جاسکتی۔ گھر بھی چھوٹے ہیں اور پرانے ہیں۔ ٹریفک اتنا بڑھ گیا ہے کہ میونسپل حدود میں روز کسی کو آفس کے اوقات میں گاڑی چلانے کی اجازت نہیں۔ ایک دن چھوڑ کر گاڑی چلائی جاسکتی ہے۔ شہر میں ٹرین اور ٹرام بھی چلتی ہے...... بجلی سے چھوٹی بس بھی چلتی ہے۔ جو نیچے سے اوپر کے شہر میں لے جاتی ہے۔ اس سے فاصلہ جلد طے ہو جاتا ہے......

اٹلی میں گزشتہ ساٹھ برس سے جمہوریت ہے۔ اس سے پہلے بادشاہت تھی۔ یہ اٹلی

کا صوبہ ہے۔ اٹلی میں اس وقت ایک مخلوط حکومت قائم ہے جس میں کرسچین ڈیموکریٹ' سوشلسٹ' ری پبلکن اور لبرل چاروں پارٹیوں کی حکومت ہے۔ کیمونسٹ بہت مضبوط حزب اختلاف کا رول ادا کرتے ہیں۔ اٹلی کے ڈکیٹٹر سولینی جس کا انجام دوسری جنگ عظیم کے بعد ہٹلر جیسا ہی عبرت ناک تھا۔ کی ایک بھانجی دائیں بازو کی پارٹی' کی سربراہ ہے۔ ویسے کرسچن' ڈیموکریٹ اس روز سے حکومت کررہے ہیں۔ جب سے اٹلی میں جمہوریت آئی ہے۔ حکومت کا پرائم منسٹر سوشلٹ ہے لیکن مضبوط اختلاف کی وجہ سے حکومت کرنے میں بہت دشواری محسوس کرتا ہے۔

اٹلی کے لوگ چھوٹے قد کے ہیں۔ زیادہ لوگوں کے کالے بال اور کالی آنکھیں ہیں...... ویسے خوبصورت قوم ہے۔ کھانے پینے کی شوقین اور موسیقی کی رسیا۔ سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ بنے ہوتے ہیں...... گرمیوں میں سارے یورپ سے لوگ بحیرہ روم کے اس خوبصورت شہر اور کیپری کے جزیرے میں چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں...... سری لنکا کے لوگ گھروں میں مدد کرنے کیلئے آتے ہیں...... دوسرے ملکوں کے لوگ کم ہیں...... گھریلو مدد کے لئے اجرت بہت زیادہ ہے۔ ہمارے میزبان کے ہاں ہفتے میں ۴ روز ایک عورت صبح ۹ بجے سے ایک بجے تک کام کرتی ہے۔ اس کے بال اس طرح بنے ہوئے تھے۔ جیسے گھر کی مالکہ کے۔ اس طرف لپ اسٹک اور میک اپ۔ اجرت اتنی جو ہمارے ۲۲ گریڈ کے افسروں کی تنخواہ ہے...... حیرت بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں زندگی میں بھی فرق ہے۔

میری یہاں موجودگی میں ''خواتین کا عالمی دن'' ۸ مارچ کو منایا گیا۔ سارے شہر میں جگہ جگہ سبز پتوں والے زرد پھول بک رہے ہیں۔ یہ پھول ہمارے ہاں املتاس کے پھول سے ملتا ہے اس درخت کا نام ''Miwo SA'' ہے۔ اونچا ہے اور سرسبز

ٹہنیوں کے ساتھ زرد پھول بڑی بہار دیتے ہیں۔ یہ درخت بہت گھروں میں بھی لگا ہوا ہے...... شاید کوئی خاص وجہ ہو کہ صرف یہی پھول عورتوں کے عالمی دن کے موقعے پر خواتین کو پیش کیا جائے۔

ایک دن ہم کیپری سے ۱۳ کلومیٹر دور ایک پرانا شہر Possuoli دیکھنے گئے۔ جونومبر ۱۹۷۰ء میں ایک شدید زلزلے سے بالکل تباہ ہوگیا تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سمندر کے نیچے اس شہر کا تعلق لاوا کے لحاظ سے پومیاتی سے ہے۔ اس لئے یہاں شدید زلزلہ آیا۔ یہ شہر پرانے وقت میں ملاحوں کی سرزمین تھی۔ جہازوں کی آماجگاہ تھی۔ اور رومن وقتوں میں یہاں سے سارے یورپ میں تجارت ہوتی تھی۔ کچھ سال پیشتر زلزلے کی وجہ سے اس بستی پر اتنی تباہی آئی کہ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب زندگی لوٹ تو آئی ہے لیکن اکثر گھر ویران پڑے ہیں۔ وہ ختم ہو گئے ہیں۔ شیشے اور دروازے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہاں ایسے چشمے بھی ہیں۔ جو معدنیات سے بھرپور ہے۔ بعض جگہوں پر رومن دور کے مجسمے بنے ہوئے ہیں۔ چرچ ہیں' دکانوں پر رونق ہے اور سمندر کا نظارہ پرلطف ہے۔ تیز موجیں سطح سمندر سے اوپر آتی ہیں...... اور خنک ہوائیں اچھی لگتی ہیں...... گرمیوں میں یہ جگہ بڑی پرسکون ہوگی......

اٹلی میں اگر پومیاتی کا وہ شہر اگر نہ دیکھا جائے جو صدیوں زمین کے نیچے دفن رہا...... اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوا...... تو زیادتی ہوگی...... میں چنانچہ ایک دن پومیاتی گئی...... کیپری سے ۲۵ کلومیٹر دور یہ شہر ۹۷ قبل مسیح میں ایک بہت شدید زلزلے سے زمین میں دب گیا تھا۔ یہ ۲۰ ہزار افراد کی ایک بستی تھی۔ جو تجارت کرتے تھے لیکن لاوا' مٹی' ریت اور پتھروں کے نیچے زندگی ٹھہر گئی۔ ختم ہوگئی۔ سترہویں صدی میں اتفاق سے اس دبے ہوئے شہر کی کچھ اشیاء وہاں سے ملیں۔

1754ء میں پہلی بار باقاعدہ طور پر اس شہر کی کھدائی شروع ہوئی لیکن گزشتہ دو صدیوں میں بڑے جامع طریقے سے اس شہر کے مدفن حصے دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار سال پہلے اس جگہ کتنی ترقی یافتہ قوم آباد تھی...... تاریخی حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر ۴ صدی قبل از مسیح سے آباد تھا۔ لوگوں کا ذریعہ معاش ماہی گیری تھا۔ پانچویں صدی قبل از مسیح میں یہاں یونانی لوگ بھی ماہی گیری کے لئے آ گئے۔ یونانی تہذیب کے اشارات یہاں اس دور میں بھی بہت نمایاں ہو گئے۔ یہاں اس طرح روم کا قبضہ ہو گیا۔ رومیوں کو یہ علاقہ اتنا پسند آیا کہ بادشاہ نے اپنا محل بھی یہاں بنوایا۔ اور امراء نے نہایت خوبصورت وِلاز اپنے لئے تعمیر کئے۔ یہاں رومن تہذیب تمدن اور امور سلطنت کے وہ تمام فنون اس جگہ کا حصہ بنے۔ جو رومیوں کی خاصیت تھی۔ پہلے ۶۲ قبل از مسیح میں یہاں ایک زلزلہ آیا۔ جس سے شہر نقصان کے باوجود قائم رہا لیکن ۷۹ قبل از مسیح کے زلزلے نے اس شہر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

......☆......☆......☆......

کھدائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دو مین سڑکیں شہر میں سے گزرتی تھیں۔ ایک شمال سے جنوب کی طرف اور دوسری مشرق سے مغرب کی طرف۔ ہر موڑ پر ایک گیٹ تھا۔ کل ۸ گیٹ تھے اور اس طرح شہر ۹ حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ مغربی دیواروں سے سڑک سیدھی سمندر کی طرف جاتی تھی ایک بہت بڑے موڑ پر ایک یونانی دیوتا کا مجسمہ تھا۔ جس کے اوپر سونے کا ایک بڑا سا چمکتا لیمپ تھا۔ جو رات کو خوب چمکتا تھا۔ اب یہ لیمپ کیپری کے میوزیم میں پڑا ہوا ہے۔

پومیاتی کے اجڑے ہوئے شہر کو دیکھ کر چند ساعتوں کے لئے انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔ صدیوں پرانے اس شہر کی طرف تعمیر ناقابل بیان حد تک خوبصورت اور واقع ہے۔ حیرت ہے اسے پرانے انسان اتنی پائیدار اور خوبصورت عمارات اور شہر کیسے بنا لیتے تھے۔ جب سب کچھ ہاتھ سے کرنا پڑتا تھا۔ سردی کے باوجود بے شمار ٹورسٹ وہاں موجود تھے۔ جو یورپ کے مختلف شہروں سے ہیں...... چوڑی اور کشادہ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے مجھے عمارت کے کھنڈرات نظر آئے۔ جو ماہرین کے مطابق لوگوں کی

نشست گاہ تھی۔ جہاں شہر کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور محفل لگاتے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ جو صدیاں گزر جانے پر بھی نمایاں ہیں...... زرد، کسیری اور نیلا گہرا رنگ استعمال ہوا ہے۔ جو خوبصورت لگتا ہے......شہر سے مدفن چیزوں کو یہاں ایک میوزیم میں بھی رکھا گیا ہے۔ جن میں مختلف قسم کے برتن، یونانی دیوتاؤں کے مجسمے، مردوں کو دفن کرنے کے بکس۔ پومپیاتی کے شہریوں کی مسخ شدہ لاشیں۔ جو کنکر، ریت اور لاوا سے پتھر بن گئی ہیں۔ سونے اور چاندی کے خوبصورت زیورات، جو پرانے دور کے ان زیورات سے ملتے ہیں۔ جو مصر ایران، عراق اور دوسرے کئی ملکوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ گھر کے استعمال کے برتن، پکانے کی ہانڈیاں کونڈی، گھڑے، پیالے، پلیٹیں، چمچے جو بہت حد تک موجودہ دور کے برتنوں سے بھی ملتے ہیں......حیرت ہے کہ انسان قدیم ہو یا دنیا کے جس حصے میں آباد رہا ہو۔ ان کی بنیادی ضروریات کی چیزیں زیادہ تر ایک سی ہوتی ہیں۔ اس عجائب گھر میں عبادت اور خدا کے لئے قربانی دینے کی خاص جگہیں، اوزار، دوائیاں، اناج، دیواروں پر استعمال ہونے والا رنگ بھی موجود ہے۔ انسانی ڈھانچوں کے ساتھ ایک کتے کا ڈھانچہ بھی ہے۔ جو پتھر بن گیا ہے۔

اپالو اور وینس کی عبادت گاہیں بھی ملی ہیں جن کی یونانی پرستش کرتے تھے۔ ایک بہت بڑی بلڈنگ جس کے صرف ستون باقی ہیں۔ سیڑھیاں باقی ہیں اور چوڑے اور بڑے پتھروں کی دیواریں باقی ہیں۔ ماہرین کے مطابق پومپیاتی کی عدالت تھی۔ رومن اپنے انصاف کے لئے مشہور ہیں......اس بڑی بلڈنگ میں انصاف ہوتا تھا اور بادشاہ اور اس کے رفقاء لوگوں کی شکایات سنتے تھے۔ اسی جگہ لوگوں کا اجتماع بھی

ہوتا تھا جہاں زندگی کے دوسرے امور پر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ مذہبی تہواروں اور موقعوں کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔ اس بڑے فورم مین دیوتا جبوٹر، فروا، لونا اور دوسرے یونانی دیوتاؤں کے مجسمے بھی ملے ہیں لگتا ہے یہاں خاص موقعوں پر ان کی عبادت ہوتی تھی یا عقیدت کے طور پر ایسی جگہوں میں انہیں نصب کیا گیا تھا۔

شہر کی اور اہم عمارات بھی ملی ہیں۔ جن میں بیٹھ کر حکومت کا نظم ونسق چلتا تھا...... لکڑی کے ایک بہت بڑے ٹال کی نشاندہی بھی ہوتی ہے...... جہاں لکڑی لائی جاتی تھی اور بکتی تھی۔ پرانے وقتوں میں لکڑی سردی روکنے کے لئے بھی جلائی جاتی تھی اور کھانا پکانے کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی۔ پھر پتھر کے ساتھ عمارت میں بھی استعمال ہوتی تھی۔ لکڑی کا استعمال آج کل کے زمانے میں اس طرح ہوتا ہے۔ لیکن ان دنوں زیادہ تھا۔

اپالو کا مندر قابل دید ہے اور دیوتاؤں کے مندر بھی ہیں جہاں رومن سلطنت کے بانی کی پرستش بھی کی جاتی تھی۔ عبادت گاہ میں دیوتا کے مجسمے کے ساتھ عبادت کے سارے لوازمات موجود ہیں۔ دیا رکھنے کی جگہیں بھی ہیں۔ یہاں بھی دیواروں پر نقش و نگار اور دیوتاؤں کی تصویریں نظر آتی ہیں...... جو صدیاں گزر جانے پر بھی محفوظ ہیں اور جن کے رنگ پھیکے نہیں ہوئے...... پبلک مارکیٹ کی جگہ بھی بڑی وسیع اور کشادہ ہے...... چاروں طرف اناج رکھنے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ دو کانوں کے نشان ہیں...... لوگوں کے آنے جانے کے لئے زینے ہیں...... کہیں کہیں چھت موجود ہے۔ زیادہ کھلا ہے۔ سلیٹی پتھر کی سلوں کے ساتھ سفید ماربل استعمال ہوا ہے۔ چوڑائی میں پتھر اتنا موٹا ہے کہ مضبوطی کے ساتھ خوبصورت بھی ہے۔ قصاب اور مچھلی فروشوں کی دکانیں

بھی ہیں۔

ایک عبادت گاہ میں شاہی خاندان کے افراد کے مجسمے ہیں۔ ایک جگہ دو شاہی ملازم شراب کے مٹکے اٹھا کر محل کی طرف جاتے پینٹنگ میں دکھائے گئے ہیں۔ پبلک حمام بہت تعداد میں ہیں...... پرانے یونانیوں اور رومیوں کے حمام بہت مشہور ہیں...... جہاں لوگوں کے اجتماع کے ساتھ سردی اور گرمی میں لوگ نہانے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ گہرے تالاب نما ٹب بنے ہوئے ہیں۔ پانی کے نل ہیں...... دیواروں پر خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ جو حوادث زمانہ کے باوجود قائم ہیں۔ نقش و نگار سے خوبصورت تصویریں غسل کے وقت ویسے بھی اچھی لگتی ہوں گی۔ وہیں دو انسانوں کے ڈھانچے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ جو اصل ہیں لیکن لاوا اور ریت مٹی سے پتھر کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان عورت کا ڈھانچہ ہے اور دوسرا ایک نوجوان مرد کا۔

شہر میں رہائش کے مکان ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ گلیاں چوڑی اور کشادہ ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نل لگے ہوئے ہیں۔ گلیوں پر کچھ فاصلے پر چوڑے پتھروں کے ساتھ راستہ بنا ہوا ہے۔ جو مال مویشی اور گدھا گاڑیاں وغیرہ کے لئے راستہ ہے تاکہ باآسانی گزر سکیں...... مکانوں کی دیواریں مضبوط پتھر کی ہیں۔ زیادہ پر چھت نہیں۔ جو یقیناً شدید زلزلے سے ملبہ بن گئی...... دیواروں میں خانچے بنے ہوئے ہیں۔ کونڈی، چکی اور مٹکے پڑے ہوئے ہیں...... مٹکے تو بالکل ایسے ہیں جو آج کل بھی استعمال ہوتے ہیں...... چھوٹے مکانوں کے بعد بڑے مکان شروع ہوتے ہیں۔ جو یقیناً امیر لوگوں کے ہوں گے۔ ان کے کمرے بڑے ہیں اور دیواروں پر نقش و نگار

ہیں...... ایک گھر جو وائسرائے یا شہر کے کوتوال کا ہے۔ بڑا خوبصورت ہے۔ اس کے ساتھ خوبصورت باغ ہے جس میں مجسمے نصب ہیں۔ دیواروں پر نقش و نگار ہیں۔

شہر کی سب سے خوبصورت عمارت وہ تھیٹر ہے۔ جو وسیع ہے اور بالکل موجودہ طرز کے تھیٹر کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ سیڑھیاں اور نشستیں اوپر سے شروع ہوئی ہیں اور نیچے تک آئی ہیں...... اوپر کی جگہ زیادہ کشادہ ہے۔ ساتھ زینے بنے ہوئے ہیں جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی محفوظ ہیں۔ تھیٹر گولائی میں بنا ہوا ہے اور اوپر سے نیچے تک بے شمار نشستیں ہیں۔ جن میں بیک وقت ہزاروں لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ رومنز تھیٹر کے شوقین تھے۔ گانے بجانے، کھیلوں کے شیدائی تھے۔ شام کو امراء کا خاص طور پر ایسی جگہوں پر اجتماع ہوتا تھا۔ جہاں آپس میں ملنے جلنے کے علاوہ کھیلوں، موسیقی اور ڈرامے سے بھی وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

تھیٹر اپنی تمام تر جاہ و شان کے ساتھ زمانے کی بے ثباتی کا شکوہ کر رہا ہے۔ جانے کتنے لوگوں نے یہاں خوشی و مسرت کے لمحے گزارے ہوں گے...... وقت کتنا ظالم ہے جو لمحہ گزر جائے۔ واپس نہیں آتا اور کیسی کیسی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔

مدفن شہر کے ساتھ ایک بڑا خوبصورت باغ ہے اونچے بلند قامت چیڑ اور برگد کے درخت ہیں۔ یہ درخت تو اس دور کے نہیں ہوں گے بعد میں ہی لگائے گئے ہیں۔ لیکن وہاں بھی پرانے دروازے پرانی محرابیں پرانے پتھر۔ پرانی نشانیاں بتا رہی تھیں۔ کہ یہاں ۲۰۰۰ پرانے پومپیاتی کے شہر کے آثار ہیں۔

میں ان کھنڈرات میں گزرتے ہوئے سوچتی رہی...... جانے وہ قدیم لوگ اس وقت کیا کر رہے ہوں گے جب ایک خوفناک زلزلے نے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور

پھر صدیوں تک اس شہر کا نام ونشان مٹ گیا۔ کسی نے کبھی نہ سوچا کہ یہاں کبھی آبادی تھی یا کبھی انسان بستے تھے...... میں ان اونچے نیچے پتھروں کی گلیوں میں ان انسانوں کو ڈھونڈتی رہی جو یہاں کے مالک تھے۔ میں آب دیدہ ہوگئی ان بدقسمت انسانوں کے لئے جو لمحوں میں موت کے اندھیروں میں کھو گئے تھے۔

بہر کیف کچھ روز کیپری میں ٹھہرنے کے بعد میں نے واپس جنیوا جانے کی تیاری کی۔

......☆......☆......☆......

جنیوا میں انسانی حقوق کمیشن کی روداد

جہاز نے صبح جب جنیوا کے لئے ائیر پورٹ سے پرواز کیا۔ تو سردی اور خنکی سے صبح ابر آلودہ تھی۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد جب کپتان نے مسافروں سے خطاب کرتے ہوے کہا کہ ہم افغانستان۔ ازبکستان۔ روس۔ پولینڈ۔ اسٹریا۔ اور جرمنی سے ہوتے ہوئے فرینک فورٹ اتریں گے۔ تو میں نے اشتیاق سے جہاز کی چھوٹی سی کھڑکی کو اونچا کر کے جھانکا تو احساس ہوا کہ ہم ظہیر الدین بابر کے ملک پر پرواز کر رہے ہیں۔ صدیوں پہلے کا زمانہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ جب بابر کی فاتح افواج نے افغانستان سے خیبر کے راستے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اور فتح کے شادیانے بجاتے دہلی کی کمزور سلطنت پر قبضہ کرلیا تھا، اور یوں دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر 1526ء میں اِس سرزمین میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور چار صدیوں تک اِس خاندان کے سربراہوں نے ہندوستان کو ایک منظّم حکومت دی جس میں فتوحات کے ساتھ فنون لطیفہ میں بھی ترقی

ہوئی۔مغل عمارات، مغل باغات، مغل سنگتراشی، مغل مصوری اور علم وادب نے برصغیر کی تاریخ کو مالا مال کر دیا۔

بابر کے ملک پر پرواز کرتے ہوئے میں ان برف سے ڈھکی پہاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ جو افغانستان کو محیط کیے ہوئے ہیں۔ برف کے ساتھ نیچے بے آب و گیاہ میدان تھے۔ بابر ہندوستان کا شہنشاہ بن جانے پر بھی کبھی اپنے وطن کو نہ بھول سکا۔ تزکِ بابری، میں اِس کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ ہندوستان کی گرمی، جس آور گرد وغبار کے ساتھ اُسے وطن کے سبزہ زار یاد آتے ہیں۔ وہاں کے چشمے آور آبشاریں یاد آتی ہیں۔ اس لئے اس نے ہندوستان میں اپنے مختصر دورِ حکومت میں بھی باغات لگوانے، نہریں نکلوائیں، ابشاریں بنوائیں، حسن کا تصور پانی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے مغل تعمیرات میں ہر جگہ پانی، نہریں اور آبشاریں ہیں، فوارے ہیں، سبزہ زار ہیں۔حوادث زمانہ سے وہ سب کچھ قانع ہو گیا ہے۔لیکن جو بھی ہے، اس میں قدرت سے محبت کوٹ کوٹ کر نمایاں ہے۔اور پھر تاریخ میں اسکا ذکر ہے۔مغلوں نے برصغیر کو جن باتوں سے مالا مال کیا۔وہ تاریخ کا ایک اہم پہلو ہے۔

فرینک فورٹ میں دو گھنٹے کا بریک تھا۔صرف **50** سال پیشتر ہٹلر نے اس ملک پر خود اسکی اپنی وجہ سے جو تباہی آئی۔ وہ بھی ایک حقیقت ہے۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اِس قوم نے چند سالوں میں مسمار شدہ عمارات اور برباد گھروں کو جس طرح آباد کیا۔ وہ حیرت انگیز ہے۔ جرمنی کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ملک تقریباً نصف صدی پہلے ملبہ کا ڈھیر تھا۔ہٹلر جیسے لوگ دنیا میں کئی آئے۔ جو اپنی ذہانت اور قابلیت کو اگر نفی سمت استعمال نہ کرتے تو دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ہٹلر، ہلاکو خان، چنگیز خان، فرعون، مسولینی، اور ایسے بے شمار نام تاریخ میں انمٹ ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے نسل انسانی کی تباہی کیلئے اپنی

بہترین صلاحیتیں صرف کیں، اور اپنا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔قدرت کے فیصلوں میں دیر ضرور ہوتی ہے۔لیکن اندھیر نہیں ہوتا۔لیکن ایسے لوگوں کی سوانح حیات پڑھتے اور دیکھتے ہوئے یہ میں ضرور سوچتی ہوں کہ انجام تو ایسے ہونا تھا۔لیکن ان کے دم سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کی زندگی بے وقت ختم ہو گئی، خوف و ہراس اور تشدد سے اتنا ظلم انسانوں پر ہوا۔جس کا مداوا کوئی نہیں۔

آخر چند انسانوں کی وجہ سے انسانیت پر اتنا ظلم کیوں ہوا شاید ایسے لوگوں کی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے ایسا سبق بن جاتی ہے، لیکن لوگ پھر بھی نہیں سوچتے۔ طاقت اور اقتدار کے نشے میں مدہوش لوگوں میں سوچ اور سمجھ کی قوت باقی نہیں رہتی۔ یہ انسانیت کا المیہ ہے۔ ہمیشہ سے دنیا میں ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔لیکن اسی دنیا میں ایسے ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جو انسانیت کی معراج ہیں۔انسانوں کا نجات دہندہ ہیں! یہ تاریخ ہے، یہ دنیا ہے، اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

شام کو جنیوا پہنچے برف سے ڈھکے پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ خوبصورت شہر جس میں جنیوا جھیل کی نیلاہٹ دور سے نظر آتی ہے۔صاف ستھری سڑکوں اور خوبصورت گھروں کا مسکن ہے۔ جہاں ہنگامہ کم ہے۔لوگ کم ہیں، اور وسعت کا احساس ہوتا ہے، اس کے باوجود کہ یہ شہر تقریباً **130** کلومیٹر کے رقبے پر مشتمل ہے۔کشادہ لگتا ہے، اس لیے کہ آبادی زیادہ نہیں، بلکہ آپ کو ان کی حکومت کے سروے کے مطابق آبادی اور کم ہوتی جا رہی ہے۔ جو اِن کے لئے لمحہ فکر ہے، لوگوں نے اپنے خاندان مختصر کر لئے ہیں۔ایک یا دو سے زیادہ بچے کسی گھر میں نہیں۔ یہ تو اس ملک میں یو این او کے دفاتر اور ہیڈ کوارٹر کی وجہ سے سارا سال رونق رہتی ہے۔اور دنیا کے بیشتر ممالک سے لوگ یہاں آتے جاتے ہیں ورنہ یہاں کی آبادی کم ہے اور دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ادھر وطن عزیز میں روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی سے ہمارے ذرائع محدود اور ہماری قوت برداشت کم ہوتی جا رہی ہے

۔خاندانی منصوبہ بندی غریب اور پسماندہ لوگوں میں بالکل بے اثر ہے۔اس کی بڑی وجہ جہالت بھی ہے۔اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ خواتین کا آپریشن شوہر کی رضامندی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔اور شوہر اس کی اجازت نہیں دیتے۔حالانکہ اس میں ان کی بھی بہتری ہے۔لیکن اگر سوچ اس طرح کی ہو۔ورنہ عورت سب کچھ سہتی ہے۔جسمانی لحاظ سے بھی اور ذہنی لحاظ سے بھی بچوں کی پیدائش اس پر ہی اثر انداز ہوتی ہے۔مرد کی مردانگی زیادہ بچے پیدا کرنے میں سمجھی جاتی ہے۔وہ بچے معاشرے پر بے شک بوجھ ہوں۔یا والدین ان کی بنیادی ضرورت بھی پوری نہ کر سکیں۔یہ اس کا مسئلہ نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہماری زیادہ آبادی ہر اس تحفظ سے محروم ہے جو والدین بچوں کو مہیا کرتے ہیں۔ملک اور حکومت تو وہ سب کچھ ہمیں مہیا نہیں کرتی اس لئے وہ معصوم بچے جن کی عمر کھیلنے اور سکول جانے کی ہوتی ہے۔ماں باپ کے ساتھ مشقت کرنے میں لگ جاتے ہیں۔یا بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ایسے بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ماں باپ محنت مزدوری کرنے جاتے ہیں تو معصوم بچے گھروں میں چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔کوئی تربیت ان کی نہیں ہوتی، کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، کوئی سکھانے والے نہیں ہوتا، اسلئے معاشرہ ان برائیوں کا مرتکب ہو جاتا ہے جو کسی لحاظ سے ہمارے لئے سود مند نہیں ہوتا۔بسا اوقات اپنے ملک میں چھوٹے بچوں کو رات گئے موٹر کے شیشے صاف کرتے یا بھیک مانگتے یا ماچسیں بیچتے دیکھ کر دل بہت کڑھتا ہے۔اگر ان ہی بچوں کی تربیت ہو، وہ تعلیم حاصل کر سکیں، اچھی خوراک کھائیں، اچھا لباس پہنیں، وہ بچے کتنے اچھے شہری بنیں اور قوم کی تشکیل کریں۔لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ان غریب لوگوں کو دو وقت پیٹ بھر کر آٹا بھی مل جائے تو وہ اپنی خوش نصیبی تصور کرتے ہیں۔اس طبقے میں اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرد بیکار گھر میں بیٹھ کر سستا نشہ کرتے ہیں اور عورتیں مزدوری اور نوکریاں کر کے گھر کا چولہا جلاتی ہیں۔ایسے شوہر بسا اوقات مار پیٹ کر کے اپنی عورتوں سے پیسے بھی زبردستی لے لیتے ہیں

اور وہ بچاری رونے پیٹنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔اپنا رونا کس کے سامنے روئے۔اپنے حقوق کیلئے کسے کہیں۔نہ تو کوئی ذرائع ہیں، نا کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی پرسان حال ہے۔اس طرح روتے پیٹتے ان کی زندگی کے شام وسحر ختم ہو جاتے ہیں۔اور دنیا میں آنے کے باوجود وہ دنیا کی ہر آسائش ہر آرام سے محروم زندگی گزار کر موت کی دہلیز پر قدم رکھ دیتی ہیں۔یہ انسانیت کا المیہ ہے۔

پرانے وقتوں میں بھی ایسا ظلم ہوتا تھا۔لیکن اکیسویں صدی کے آغاز میں جب دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے۔سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔اپنی حق تلفی، ایسا ظلم ناقابل فہم ہے۔ہمارے ہاں غریب عورت کو اپنے جسم پر بھی کوئی اختیار نہیں۔وہاں ہم کس طرح کسی بہتری کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

یو این او اس سال اپنی پچاسویں سالگرہ منائے گا۔اس ادارے کی بڑی عمارت تو **1937**ء میں بنی تھی۔حالانکہ اس وقت یو این او کا وجود نہیں تھا۔**1973**ء میں اِس عمارت میں بڑی چیزوں کا اضافہ ہوا، لیکن گزشتہ چند سالوں میں اور عمارتیں بھی بنیں۔ جن میں یہاں کا بڑا ہال، بڑے بڑے چھ مزید ہال، مصوری کی گیلری، جنرل اسمبلی ہال، اور چاروں طرف پھیلے ہوئے سرسبز گھاس کے خوبصورت تختے۔سامنے جنیوا جھیل ہے۔ مور بھی بارہا اپنے پنکھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔پھر سنگتراشی کے اعلیٰ نمونے تھے۔اور یو این او کا بڑا سا گلوب جو باغ کے ایک طرف، انسانی حقوق کا پیغام دیتا معلوم ہوتا ہے۔اس پر مختلف تصویریں کنداں ہیں۔جو انسانی حقوق کی پامالی کی ایک جھلک ہیں۔

جنیوا کا پرانا شہر تو الف لیلےٰ کی داستان معلوم ہوتا ہے۔چکور پتھر سے تراشیدہ چوڑی صاف ستھری گلیاں، کچھ نشیب میں، کچھ اونچائی پر، جہاں موٹر نہیں جا سکتی۔۔۔ لوگ پیدل چلتے ہیں۔پرانے چرچ، کلیسے، آرٹ گیلریاں، مصوری کے اعلیٰ شاہکار، اور سنگ تراشی کے نمونے نظر آتے ہیں۔پرانے شہر میں ایک خوبصورت باغ ایک شہری جو

میونسپل کونسلر بھی تھا، نے دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے شہر کو تحفہ دے دیا تھا۔ اس باغ کے ساتھ پرانے رومن گھر بھی نظر آتے ہیں۔ گلاب کے پھول ہیں، بہار اور گرمی میں تو یہاں پھولوں کی مہک اور رنگ سے فضا بڑی روشن اور خوبصورت لگتی ہوگی۔

پرانے شہر میں صدیوں پہلے رومیوں کے وجود کا احساس ابھی بھی ہوتا ہے۔ اُن کی حکمرانی کا احساس ابھی بھی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی کئی یادگاریں ابھی بھی شہر میں موجود ہیں۔ پرانے مجسمے، پرانے گھر، پرانے چرچ، پرانے سنگ تراشی کے نمونے، پرانی گلیاں، اور پرانی آرٹ گیلریاں سب جنیوا کے پرانے شہر کی رونق ہیں۔ ایک پرانی عمارت **763** سال پرانی ہے۔ ایک اور بڑی سی عمارت جس کی **157** سیڑھیاں ہیں۔ صدیوں پہلے رومن دور کی ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کی ایک خانقاہ کا ابھی حال ہی میں پتہ چلا ہے۔ اوپر نیچے پھیلا ہوا پتھروں کا یہ شہر جس کے پرانے گھروں پر ابھی بھی جانوروں کی سفید سنگ مرمر یں تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ آرٹ کا ایک نمونہ ہے۔

تراشیدہ اور بیل بوٹوں سے آراستہ لکڑی کی بالکنیاں کئی گھروں میں نظر آتی ہیں۔ حکومت نے پرانے گھروں کی باہر کی ساخت کو گرانا ممنوع قرار دیا ہے۔ تاکہ تاریخ کے آثار قائم رہیں۔ بعض گھروں کی ساخت بڑی خوبصورت ہے۔ لکڑی اور سفید رنگ مرمر اور پتھر کا استعمال ہوا ہے۔ پرانے شہر میں ساتھ ساتھ دکانیں، ریسٹورنٹ اور زندگی کی چہل پہل قائم ہے۔ تالاب، فوارے، نیچے اترتی سیڑھیاں اوپر جاتی سیڑھیاں، سب بڑا جاذب نظر ہے۔

پرانے گھروں میں ابھی بھی چمنیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن سے اب تو دھواں نہیں نکلتا لیکن جب آگ جلتی تھی یا کوئلہ جلتا تھا تو ان میں دھواں نکلتا ہوگا۔ اب تو گھروں کو گرم کرنے کا ماڈرن سسٹم ہے۔ لیکن گھروں پر چمنیاں بڑی خوبصورت لگتی ہیں۔

پرانے شہر میں ایک جگہ ایک شیروں والی خوبصورت صدیوں پرانی عمارت ہے

کہتے ہیں اس جگہ ایک ملکہ کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ جنیوا کا ایک بہت مخیّر شہری جس نے اپنی ساری جائیداد شہزادے کو دے دی تھی۔ اور خواہش ظاہر کی تھی کہ یہاں اس کا ایک مقبرہ سفید رنگ مرمر سے بنایا جائے۔ جو آرٹ کا لاجواب نمونہ ہو۔ جس کی ساخت میں پیسے کی پروانہ کی جائے، یہاں موجود ہے۔ سامنے جنیوا جھیل کا خوبصورت منظر ہے۔ یہ شہر چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ بعض پہاڑ بہت اونچے ہیں بعض زیادہ اونچے ہیں۔ برف کی سفید طے ان پر جمی ہوئی ہے۔ اونچی چوٹیاں تو بالکل برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ گرمیوں میں جب برف پگھلتی ہے تو نیلے اور سبز پہاڑوں سے یہ خوبصورت شہر اور بھی خوبصورت لگتا ہے۔ مہکتے رنگ برنگی پھولوں کے تختے اور سرسبز گھاس کے قطعے، سامنے جنیوا جھیل کی نیلاہٹ سب بڑا جاذب نظر لگتا ہوگا۔

جنیوا شہر میں کئی میوزیم ہیں ہر دور کے ہر ملک کی چیزیں موجود ہیں۔ میں صرف ایک میوزیم میں گئی جو آرٹ میوزیم ہے اور یہاں کا مشہور میوزیم ہے۔ بے شمار سیاح موجود تھے، آرہے تھے، جا رہے تھے۔ چار منزلوں کا یہ بڑا سا میوزیم صدیوں کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ کچھ ملکوں کی چیزیں جو یہاں پڑی ہوتی ہیں۔ **330** قبل از مسیح کی ہیں۔ **664** قبل از مسیح سے **1500** قبل از میم اور **1750** قبل از مسیح تک کی ہیں۔ بعض چیزیں **2500-2000** قبل از مسیح کی بھی ہیں، اور زیادہ پرانی چیزیں حال کی کھدائیوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ ساتھ کھدائیوں کے نقشے اور تصویریں بھی بنی ہوتی ہیں۔ جگہوں کی نشاندہی بھی ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے یہ کام ہوتا رہے گا۔ کیونکہ ''جستجو'' انسان کی فطرت میں ہے اور اب سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کھدائیاں بھی آسان ہیں، اور یہ معلوم کرنا بھی مشکل نہیں کہ یہاں زمین کے اندر کیسے کیسے خزانے مدفن ہیں۔

بارھویں اور **17** صدی کے مختلف ملکوں کے نوادرات یہاں پڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کے محلات کے چینی کے نایاب برتن، زیورات، دھات کے برتن

مصوری کے شاہکار قالین ،فرنیچر،شیشے کی خوبصورت آرائشی چیزیں سوئی اور دھاگے سے کڑھے ہوئے خوبصورت کپڑے،نشست گاہوں کی پوری چیزیں،لکڑی کی نایاب چیزیں باریک اور نقش کیا ہوا نام لکڑی پر اتنا نفاست سے بنا ہوا ہے کہ قدیم انسان کی قابلیت اور ہنرمندی سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ایک لکڑی کی منقش بارہ دری بھی ہے، ساتھ قد آدم آئینہ جس کے چاروں طرف لکڑی سے کاٹ کر نہایت نفیس کام کیا گیا ہے۔ ایک خوبصورت عورت کی نشست گاہ بھی ہے ۔جس میں نہایت خوبصورت فرنیچر، اور ضرورت کی دوسری چیزیں ہیں۔اس عورت کی بڑی خوبصورت تصویر بھی پینٹنگ کے طور پر اس کمرے میں ہے۔جو یہ چیزیں استعمال کرتی تھی۔ایک جگہ سبز پتھر کو کاٹ کر باریک کام کیا گیا ہے ۔ اس میں تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں جو زیادہ تر جانوروں کی ہیں ۔ دیواروں پر لٹکانے کیلئے خوبصورت آرائشی چیزیں ہیں،جن پر ہاتھ سے سوئی کا کام بنا ہوا ہے۔ایک جگہ شتر مرغ کا پتھر اور ہاتھی دانت میں پڑی ہوئی ہے۔لکڑی کا آتشدان،اس کے ساتھ منقش لکڑی کا فریم بڑا دیدہ زیب ہے۔دیواروں کی آرائش پرندوں کی تصویروں سے ہے۔لکڑی کے بڑے بڑے منقش باکس جو آبنوس کے معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً چیزیں اور کپڑے رکھنے کے کام آتے ہونگے۔بھاری اور دیدہ زیب ہیں۔لکڑی کے قلمدان اور لکڑی کے سیف بھی پڑے ہوئے ہیں۔

میوزیم کی تیسری منزل میں مختلف وقتوں کے مجسمے اور مصوری کے شاہکار پڑے ہیں۔اس جگہ باریک کام کے فرش کے نمونے بھی ہیں۔یہ چیزیں زیادہ تر **14** سے **18** صدی کی ہیں اور یورپ کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔دونوں پر خوبصورت شنگھائی اور اطلس کے کور ہیں۔دونوں کا سٹائل بہت حد تک وہی ہے۔جو آجکل کے دور میں ہے بلکہ ان میں نفاست اور خوبصورتی زیادہ ہے۔

2000 سے **2500** قبل از مسیح کی چیزوں میں زیورات، دھات کے برتن،

پتھر کے برتن ، پتھروں اور موتیوں کے زیورات ، کانوں کے آویزے اور ہاتھوں کی چوڑیاں بہت حد تک وہی ہیں جو آج کل بنتی ہیں۔ایک **2000** قبل از مسیح کے انسان کا ڈھانچہ بھی ہے۔سوڈان کی **1500** قبل از مسیح کی چیزیں پڑی ہوتی ہیں۔جو کانسی،لوہے اور پیتل کی ہیں ۔ پرانے مصر کے زیورات جو سونے کے ہیں۔موجودہ دور کے زیورات کی طرح لگتے ہیں ۔ فیروزہ ، مونگا ،عقیق اور ایسے کئی پتھروں کا سونے میں استعمال ہوا ہے۔ایک لکڑی کی کشتی کا ڈھانچہ بھی ہے جو **1500** قبل از مسیح کا ہے ۔ ایران کے زیورات،چینی اور دھات کے برتن **660** سے **330** قبل از مسیح کے ہیں۔روم کے لکڑی اور چینی کے برتن بھی بڑے پرانے ہیں۔ان میں خوبصورت باریک حاشیے بنے ہوتے ہیں۔اور باریکی سے کام ہوا ہے۔

لڑائی اور جنگوں میں استعمال ہونے والے ہتھیار بھی ایک ہال میں مختلف دور کے اور مختلف ملکوں کے پڑے ہوئے ہیں۔صدیوں پر محیط آرٹ کے یہ نمونے انسان کو دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلواتے ہیں اور ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ قدیم دنیا کا انسان ہم سے کتنا آگے تھا۔جب مشینوں کا دور نہیں تھا۔ہاتھ سے زیادہ کام ہوتا تھا۔بھٹی سے کام لیا جاتا تھا۔سادے اور موٹے اوزار استعمال ہوتے تھے،لیکن ہر کام کتنا نفیس ہے، کتنا باریک ہے، کتنا خوبصورت ہے۔لوگوں کے پاس وقت زیادہ تھا۔محنت زیادہ کرتے تھے۔بادشاہوں کا دور تھا جو خوش ہو کر کاریگروں کو اجرت کے علاوہ انعام واکرام سے بھی نوازتے تھے۔

میوزیم سے واپسی پر میں سوچتی رہی کہ وہ لوگ کہاں گئے، جو ان محلات کے مکین تھے۔جہاں کی چیزیں دنیا کیلئے محفوظ کر دی گئی ہیں۔کس شان وشوکت سے وہ رہے تھے، کتنے دبدبے سے زندگی گزارتے تھے۔بعض کتنے ظالم بھی تھے۔رحم کرنا نہیں جانتے تھے۔انسانوں سے محبت کرنا انہیں نہیں آتا تھا۔ملک گیری کی ہوس میں بے گناہ انسانوں کا

خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے تھے بعض دولت کی چمک کے دیوانے تھے ۔ عیش و عشرت سے محبت کرتے تھے ۔ بعض نے شائد زندگی میں کوئی اچھا کام بھی نہ کیا ہو ۔ اور پھر بھی انہیں افسوس نہ ہو ۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں ۔ خس و خاشاک کی طرح وہ لوگ بہہ گئے ۔ عش و عشرت سے زندگی گزارنے والے آج دنیا کے لئے عدہ رفتہ سے وابستہ ہیں ۔ یہ زندگی کا المیہ ہے ۔ اور سب جانتے ہیں، کہ یہاں ہمیشہ کوئی نہیں رہتا ۔ اس لئے اگر انسان اس قابل ہو، اس اہل ہو اور زندگی میں کچھ اچھے کام کرنے کا موقعہ ملے تو انسان امر بھی ہو سکتا ہے ۔ اس کا نام زندہ بھی رہ سکتا ہے ۔ لیکن ہم لوگ اس طرح سوچتے ہیں ۔ دنیاوی زندگی میں اتنی کشش ہے کہ صاحب اقتدار اور صاحب ثروت لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زندگی دائمی نہیں، دنیا کی لا تعداد آسائشوں اور دولت کی محبت میں سرشار زندگی گزار دیتے ہیں ۔ سب کچھ یہیں رہ جانا ہے ۔ یہ تو انسان کی خوش قسمتی ہے اگر اُسے حکومت، پیسہ، فراوانی اور اقتدار نصیب ہو ۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کا مصرف صحیح ہو، اور انسان اکڑ کر زمین پر نہ چلے ۔

سارے شہر میں باغات ہیں، میوزیم ہیں، تھیٹر ہیں، آرٹ کے نایاب نمونے ہیں ۔ مصوری کی گیلریاں ہیں ۔ جو صدیوں سے فن اور ثقافت کی خدمت کر رہے ہیں ۔ سوئزرلینڈ کی آبادی 6 ملین ہے یہ ملک پہاڑی ہے، رقبے کے لحاظ سے زیادہ بڑا نہیں ۔ یورپ کے سارے ملک اپنے طور پر آزاد ہیں اور ساتھ ساتھ ہیں ۔ آخر ایک براعظم ہے ۔ صرف بارڈر پر ہر ملک کا ویزا دکھانا پڑتا ہے ۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ شہر اور اس کے گردونواح قدرت کے تمام تر حسن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۔ یہاں رہ کر اور دیکھ کر کشمیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، بلکہ قدرتی حسن کے لحاظ سے زیادہ خوبصورت ہے ۔ اونچے سربفلک پہاڑ دنیا کی اونچی ترین چوٹیاں وہاں ہیں ۔ کھلے سرسبز میدان، پانی کی بہتات ۔ بہتے چشمے اور راگنی الاپتی ہوئی آبشاریں، خوبصورت مہکتے پھول اور مسکراتی وادیاں وہاں کا

حسن ہے ۔ ان خوبصورت وادیوں میں گزشتہ پانچ سال سے آگ و خون کا ہولناک ڈرامہ رچا ہوا ہے ۔ بھارت کی 6 لاکھ منظّم اور بے شمار افواج مجاہدین کی یلغار اور آزادی کی تڑپ کو نہیں روک سکی، لیکن ظلم تشدد، قتل و غارت، اغوا اور خواتین کی بے حرمتی میں آزادی کی تحریک کو وہ کچل دینا چاہتے ہیں ۔ لیکن انہیں شدید ناکامی کا سامنا ہے ۔ وہ اس جذبے کو دبا نہیں سکے ۔ ان پرسکون وادیوں کے لوگ حریت کے جذبے سے سرشار بھارت سے نبرد آزما ہیں ۔ وہ خوبصورت ملک جہاں دریا اور وادیاں گنگناتی ہیں، پھول مہکتے ہیں، پہاڑوں کی نیلاہٹ اور سبزہ آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے ۔ فضا میں بھی خوشبو بسی رہتی ہے ۔ اس وقت بھارت کے ناجائز قبضے کے حصار میں اپنی آزادی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے ۔ سوئٹزرلینڈ کے پرسکوں پہاڑ اور پرسکون وادیاں جو کشمیر سے مشابہ ہیں ۔ اس لحاظ سے کتنے مختلف ہیں ۔ کہ یہاں حسن کے ساتھ سکون ہے، آشتی ہے اور امن کی ٹھنڈک ہے ۔

......☆......☆......☆......

ایک دن جنیوا سے اِس ملک کے بارڈر تک جانے کا اتفاق ہوا۔ اونچی نیچی سڑکوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دور تک آبادی ہے۔ ایک جیسے پہاڑی طرز کے مکان بعض چھوٹے، بعض بڑے، ہر گھر کے ساتھ ہرا بھرا لان۔ سردی کی شدت کے باوجود رنگ برنگے پھول جن میں نرگس اور ٹیولپ Tulips ہر رنگ کے نظر آتے ہیں۔ وہی چمنی والے گھر جو بہت اچھے لگتے ہیں۔ کبھی ان میں دھواں نکلتا ہوگا۔ ابھی بھی کئی گھروں میں آتشدان میں لکڑی بھی جلتی ہے۔ لکڑی کے ٹال قرینے سے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ بھیڑیں بکریاں اور گائے سرسبز میدانوں میں گھاس چرتی ہیں۔ انگور اور سیب کے باغات ہیں۔ جو اِس موسم میں بہار پر نہیں لیکن گرمی کے موسم میں ان پر خوب جوبن ہوتا ہوگا۔ گیندا کا پھول بھی بہت نظر آتا ہے۔ پھر کاسنی رنگ کے پھولوں کی قطاریں گھروں کے اندر اور باہر دیدہ زیب لگتی ہیں۔ کئی گھروں پر بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ سرد، چنبیل اور چوڑے پتے والی بیلوں سے گھر اور بھی اچھے لگتے ہیں۔ کھیت بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن بڑے طریقے سے اس حکومت نے زراعت کو قائم رکھا ہوا ہے۔ علاقے میں آ کر واقعی احساس ہوتا ہے کہ ہم شہر

سے باہر ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح نہیں جہاں گھر کارخانے اور مکان بغیر ترتیب کے بنتے چلے جاتے ہیں۔ زراعت کی زمین ختم ہوتی جا رہی ہے۔ آبادی کا سیلاب سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے آیا ہے۔ اور حکومت کی طرف سے کوئی کنٹرول نہیں۔ لوگوں میں بھی قوم اور ملک کی ایسی محبت نہیں کہ وہ ایسی زیادتیاں نہ کریں۔ صرف اپنی ذات اپنی حیثیت اور پیسہ مقدم ہو کر رہ گیا ہے جو افسوس ناک ہے۔ Lausance کا چھوٹا سا قصبہ خوبصورت ہے۔ اس کے بعد Berue کا شہر ہے۔ پھر Zurich اور سوئٹزرلینڈ کی آخری حدود تک یہ علاوہ سوئٹزرلینڈ کی حدود ختم ہونے پر اسٹریا ہے۔ ساتھ جرمنی ہے اور اسکے بعد یوگوسلاویہ۔۔۔

دوسری بات سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں کی طرف میں گئی جو ان دنوں برف سے ڈھکے ہوئے ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ سکیٹنگ Skating کیلئے یہاں آتے ہوتے ہیں۔ اونچی برف سے لدی ہوئی پہاڑوں کی اترائی ہیں جگہ جگہ لوگ سکیٹنگ کر رہے تھے۔ مرد، عورتیں، بچے ہر عمر کے لوگ رنگ برنگے کپڑوں میں رنگ برنگی سکیٹنگ کے ساتھ سفید اجلی برف پر بڑے دیدہ زیب لگے تھے۔ ایسے علاقوں میں چند دنوں کیلئے گھر اور کمرے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ لوگ گھر والوں کے ساتھ ویک اینڈ پر یا زیادہ دنوں کیلئے آتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ درختوں اور برف میں گھرے ہوئے گھر بڑے خوبصورت ہیں۔ ہوٹل اور ریسٹورنٹ بھی آباد ہیں۔ دکانیں بھی ہیں۔ جہاں ضروریات کی سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ پہاڑوں کی طرف جاتے ہوئے Nyan کا چھوٹا سا شہر آتا ہے۔ پھر St. SB-Simplow یہ جگہیں جنیوا سے 30 میل کے فاصلے پر ہیں۔ لیکن چونکہ پہاڑ اونچائی پر ہیں اس لئے بہت چڑھائی ہے۔ اور اوپر جانا پڑتا ہے۔ یہاں ساتھ ہی فرانس کا بارڈر شروع ہو جاتا ہے۔ سکیورٹی اور پولیس کے دستے ہیں جو ویزا کے بغیر آگے نہیں جانے دیتے۔ پھول سردی کے باوجود کھلے ہوتے ہیں۔ فٹ

پاتھ میں بعض جگہ اس طرح اینٹیں اور سیمنٹ لگا ہے کہ چاروں طرف گھاس اگا ہوا ہے۔ گھاس کے کھلے میدانوں میں سفید، زرد اور کاسنی چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ کشمیر میں بھی ایسے ہی سرسبز میدانوں میں پھول کھلے ہوتے تھے۔

جنیوا سے لندن کی فلائٹ کے دوران جہاز سے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ نظر آتے رہے۔ خوبصورت پہاڑی مکان ایک ہی طرح ہے۔ ایک ہی طرز ہے۔ کہیں سبزہ کے قطعے کہیں خشکی کے قطعے۔ درختوں کے جھنڈ کوئی سرسبز، کوئی موسم کی وجہ سے زرد، فضا میں تیرتے ہوئے بادل جن میں کبھی جھلکتا ہوا سورج نظر آرہا تھا۔ آج کتنا صاف دن ہے۔

لیکن لندن پہنچنے پر لندن کے موسم نے ہی میرا خیر مقدم کیا۔ گہرے تاریک بادل اور بارش کی ہلکی پھوار سردی کے باوجود بڑی اچھی لگی۔ جنیوا سے واپسی پر میں چند روز کیلئے انگلینڈ میں آئی۔ درست واجبات اور اپنے ہم وطنوں کو ملنے کا ارادہ تھا۔ چند دن تھے لیکن پتہ ہی نہ چلا۔ ایک ایک دن انگلینڈ کے چھوٹے ٹاؤن میں ٹھہرنا اچھا بھی لگا، لیکن یہ بھی احساس ہوا کہ زیادہ دن ٹھہرنا چاہیے تھا۔ سب احباب کا بھی اصرار تھا۔ لیکن پھر اسی پر اکتفا کیا ہم سکیپلر ملک سے اتنے مانوس ہیں کہ کبھی کبھی ہر چیز ہر جگہ اپنی لگتی ہے۔ اس کی وجہ برصغیر پر انگریزوں کا سوسالہ دورِ حکومت بھی ہے۔ انکے متعلق انکے ملک کے متعلق ان کے ادب کے متعلق ہم اتنا جانتے ہیں کہ وہ ملک اپنا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ انگریز مسلمانوں سے ناروا سلوک کرتے رہے اور برصغیر کی تقسیم میں بھی ان سے ہی زیادتی کی کشمیر کا مسئلہ ہمارے چھوڑ گئے۔ ریڈکلف ایوارڈ سے بھارت کو وہ حصہ بھی دے دیا جو انکا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس قوم کی ایسی روایات ہیں۔ ایسے احوال ہیں کہ ہزاروں سے بہترین سوفٹ بھی ہمارے لوگوں کی ایک کثیر تعداد انگلینڈ میں مقیم ہے جو خوشحال ہیں۔ محنت کے ساتھ اپنا ایک مقام بنایا ہے اور اپنی روایات کے ساتھ وہاں کے شہری ہیں۔

جس کو پبلک کے اداروں میں بھی نمائندگی حاصل ہے۔

رہنے کے لئے انگلینڈ کے چھوٹے شہر بہت اچھے ہیں۔ چھوٹے بڑے ایک ہی طرز کے خوبصورت گھر، سرسبز روشیں، صاف ستھری سڑکیں اور زندگی کی عام مراعات اور سہولتیں چھوٹی جگہوں میں بھی موجود ہیں۔ ان دنوں تو سارے انگلستان میں نرگس کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ سردی اور برف باری کے باوجود نرگس اور للّی کے خوبصورت پھول مختلف رنگوں میں بڑے دیدہ زیب ہیں۔ آئندہ چند ماہ تو پھولوں کی بھرمار ہوگی۔ ہر رنگ اور ہر طرح کا پھول اس ملک کو اور حسن بخشے گا۔

انگلینڈ سے پاکستان آتے ہوئے میں چند دنوں کیلئے استنبول میں ٹھہری اس شہر میں میرا ہمیشہ آنے کا دل چاہتا تھا۔ خلافت کا ترکی، مصطفےٰ اتا ترک کا ترکی، آٹو مین سلطانوں کا ترکی ہمیشہ میرے خوابوں میں بسا رہتا تھا۔ اس بار یہ موقعہ ملا کہ میں اس ملک کو اس شہر کو دیکھ سکی۔ لندن سے استنبول پہنچنے میں صرف 3 گھنٹے لگتے ہیں۔ لندن سے برسلز، فرینک فورٹ، ویانا، پھر بوداپسٹ پر جہاز اڑتا ہوا استنبول پہنچا ہے۔ ہوائی اڈاہ زیادہ بڑا نہیں لیکن جہاز میں سیاحوں کی تعداد زیادہ تھی۔ استبول نئی اور پرانی قدروں کا شہر ہے ویسے بھی یہاں ایشیا اور یورپ ملتے ہیں ایک طرف یہی شہر ایشیا میں واقع ہے اور دوسری طرف یہی شہر یورپ میں واقع ہے ایسے پورا شہر نئی اور پرانی تہذیبوں کا سنگم ہے۔ پرانے گھر بوسیدہ ہو گئے ہیں ِ اُسکی طرز تعمیر میں بھی فرق ہے: نئے گھر ماڈرن ہیں ساتھ ملحق باغ ہیں۔ سرسبز روشیں ہیں۔ پھول ہیں۔ پرانے گھروں میں بعض گھر بڑے بھی ہیں: لیکن لکڑی اور پتھر کا استعمال آج کل سے بہت مختلف ہے۔ شہر میں گزرتے ہوئے بے شمار مسجدیں نظر آتی ہیں۔ آبنائے فاسفورس چونکہ شہر کے بیچ میں واقعہ ہے اس لیے اونچائی اور چڑھائی پر پانی کے دونوں کناروں پر دُور دُور تک یہ شہر پھیلا ہوا ہے۔ کئی جگہ موٹے پتھروں کی بڑی مضبوط دیوار ہے جو صدیوں پرانی ہونے کے باوجود قائم ہے۔ مسجدوں

کے ساتھ بڑے بڑے گنبد ہیں ۔گرے اور سفید پتھروں کی بنی ہوئی مسجدیں سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ یہاں ہزار کے قریب مسجدیں ہیں ۔ 62 پرانے چرچ ہیں ۔اور 23 یہودگا ہیں ہیں ۔سارے مذہبوں کا مکن یہ شہر صدیوں کی تاریخ اپنے میں سموئے ہے عیسائیوں نے بھی ایک ہزار سال ترکی میں حکومت کی ۔ اُن کی حکومت 1453 میں ختم ہوئی اور اُسکے بعد ترک مسلمانوں نے 600 برس تک یہاں حکومت کی ۔سلجوک ترک بھی کچھ عرصہ حکمران رہے ترکی میں آٹومین سلطانوں کی حکومت 1924 میں ختم ہوئی ۔جب ترکی کے ایک مایہ ناز فرزند کمال اتاترک نے ملک میں انقلاب لاکر بادشاہت ختم کروائی ۔اورعوام کی حکومت قائم کی وہ آزاد ترکی کے پہلے صدر تھے جو 18 سال تک اس عہدے پر فائز رہے ۔ترک ابھی بھی کمال اتاترک کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے ہیں ۔ وہ اس طرح ہر دلعزیز ہیں ۔اور انقرہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں ۔ترکی کے آخری بادشاہ کا نام سلطان محمد ششم تھا۔اور اسے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔شہر کی سڑکیں چوڑی تھیں ۔کئی جگہوں پر اوپر پل بھی بنے ہوئے ہیں اور لیکن کچھ حصے بڑے گنجان ہیں ۔ اور سڑکیں تنگ ہیں ۔ چھوٹے بڑے بے شمار ہوٹل ہیں ۔کئی ہوٹلوں کے نام مغربی ہیں ۔لیکن اکثر نام مقامی ہیں ۔ ترکی کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ AMSTRA ترکی کی پہلی آبادجگہ کا نام تھا۔ 9 صدی ق م میں یہ بستی آباد تھی ۔ دوسری آبادجگہ کا نام vigos تھا۔ جو 8 صدی ق م میں یہ بستی آباد ہوئی ۔شہری بستی کا نام bizzas تھا ۔ جو 5 صدی ق م میں آباد ہوئی ۔ شہر کے دائیں جانب جہاں سامنے سے سمندر نظر آتا ہے ۔ بہت گنجان اور جدید طرز کی رہائش گاہیں اور دوکانیں ہیں اور یہ استنبول کا شانزے لینڈ ہے ۔چھوٹے چھوٹے چائے خانے ریسٹورینٹ سڑک کے دونوں طرف گلستانی کرسیوں پر لوگ گپ شپ اور کھانے پینے میں مصروف نظر آتے ہیں ۔زمانہ قدیم میں یہاں ایران کا بھی اثر رہا۔ایران اور ترکی کی لڑائی تاریخی حوالوں سے 479 ق م میں ہوئی ۔اور اسے Platya کی جنگ کے نام سے یاد کیا

جاتا ہے ۔سمندر کی طرف جاتے ہوئے گولڈن ہارن کا علاقہ ہے ۔ یہاں ایشیا اور یورپ ملتے ہیں اور اس تاریخی شہر میں یہ دونوں براعظم دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں ۔اس شہر میں گویا ایشیا کا بھی علاقہ ہے ۔اور یورپ کا بھی یہ امتیاز صرف ترکی کو حاصل ہے ۔

ترکی کی آبادی 60 ملین ہے ۔گنجان ملک ہے جن میں استنبول کی آبادی 13 ملین افراد پر مشتمل ہے ۔استنبول پرانی اور نئی تہذیبوں کا مسکن ہے ۔اور یہاں دیکھنے کو بہت کچھ ہے ۔ترکی کے آٹومین سلطان کی آخری رہائش گاہ Dolmabahc محل تہذیب ثقافت سینگ تراشی اور نوادرات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ۔ 365 کمروں پر مشتمل یہ محل جس میں 22 ایسے کمرے ہیں ۔جن میں اس دور کی بہترین چیزیں جمع ہیں قابل دید ہے ۔ یہ محل سفید سنگ مرمر اور گرے پتھر سے بنا ہوا ہے ۔ جو زیادہ تر مصر اور چیکوسلواکیہ سے یہاں لایا گیا۔ یہ نایاب اور خوبصورت عمارت سلطان عبدل مجید نے 1856 میں تعمیر کی ۔ جس میں ملک کے بہترین کاریگروں کے علاوہ باہر سے بھی کاریگر بلائے گئے ۔آٹومین سلطانوں کی 700 سالہ ترکی میں حکومت کے درمیان یہ تیسرا محل ہے ۔ جو حکمرانوں کے لیے تعمیر ہوا ۔ان میں ایک تو شکستہ ہو کر گر گیا ہے ۔ دوسرا بہت اچھی حالت میں قائم ہے ۔ اور تیسرا اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے ۔محل کا گیٹ بہت اونچا اور بڑا ہے ۔اندر داخل ہوتے ہی محل کا کلاک ٹاور ہے : بہت اونچا اور سنگ مرمر کا بنا ہوا۔ جہاں ایک بہت بڑا کلاک نصب ہے : کشادہ باغ تین حصوں میں ہے : ہر حصہ ختم ہونے پر نئی سیڑھیاں اور نیا گیٹ آتا ہے اونچے اونچے سرسبز درخت ہر قسم کے لگے ہوتے ہیں ۔جن میں بعض بہت پرانے ہوتے ہیں ساتھ ساتھ درختوں کی نگہداشت اور دیکھ بھال یقیناً حکومت کرتی ہے ۔لیکن باغ کا ڈیزائن وہی ہے : جو سلطان نے خود بنوایا تھا۔ سنگ مرمر کے شیروں کے مجسمے باغ میں لگے ہوئے ہیں بڑے بڑے مٹکے پھولوں کیلئے گلدانوں کا کام دیتے ہیں کیاریوں کے نقوش بھی اُس طرح قائم ہیں اسوقت سرد موسم

کے باوجود باغ میں نرگس اور دوسرے پھول ہیں موسم گرما میں تو پھولوں کی بہتات سے اور ہی ماحول ہوتا ہوگا۔محل کی چوڑی چکلی فصیل کے ساتھ ساتھ نیلگوں سمندروں کی لہریں ارتعاش برپا کرتی ہیں: اور اس خوبصورت مسکن کے حسن میں اضافہ بھی ہوتا ہے محل کے کمروں میں گھومتے ہوئے عجیب طلسماتی دنیا کا منظر آنکھوں میں گھومتا ہے جب اتنی فراوانی تھی۔اتنی دولت تھی اتنی عیش وراحت تھی اور زندگی کی نوعیت ہی اور تھی۔

محل کے کشادہ اونچی چھتوں والے کمروں میں قدم آدم شیشے لگے ہوتے ہیں۔لکڑی کی عمدہ نقش ونگاری سے کمروں کے فرش بڑے منفرد ہیں۔ان میں اخروٹ اور ٹیک کی لکڑی کے ساتھ کئی مصالحوں کا استعمال ہوا ہے۔کمروں کے بیچ میں جو قالین ہیں۔ وہ تاریخی اور پرانے ہیں۔ چلنے پھرنے کے لیے جو قالین ہیں وہ بعد میں ڈالے گئے ہیں۔ایک غرض یہ بھی ہے کہ فرش خراب نہ ہوں تاریخی قالینوں پر چلنے کی ممانعت ہے۔شیشے کے بڑے بڑے فانوس لٹکے ہوئے ہیں جو فرانس اور چیکوسلواکیہ سے آرڈر پر تیار کروائے گئے۔ ملاقات کے سب سے بڑے کمرے میں جو فانوس لٹک رہا ہے۔اس کا وزن **45** ٹن ہے۔ اور وہ انگلستان کے بہترین کاریگروں نے بڑی محنت سے تیار کیا۔دنیا میں شاندار اور اس سے بڑا فانوس اور کوئی نہیں ہے، فرنیچر بہت بھاری اور نایاب قسم کا ہے۔صوفوں اور کرسیوں پر سرخ اطلس کا بھاری کپڑا چڑھا ہوا ہے۔کسی کمرے میں گہرا سبز اور گہرا گلابی اطلس بھی استعمال ہوا ہے۔ چھتوں پر سونے کے پانی سے گلکاری کی گئی ہے۔شمع دان کانسی، شیشے اور چاندی کے بنے ہوئے ہیں۔کسی نشست گاہ میں سونے کی شمع دان بھی ہیں۔آتشدان بھی منقش لکڑی کے بنے ہیں۔جن میں پیتل اور شیشے کا نفیس کام بھی ہوا ہے۔بعض کمروں میں بڑے بڑے ستون ہیں۔جن پر نقش وسنگار بنے ہوئے ہیں۔مزین چاندی کی گلکاری اور بھاری کام سے بڑی خوبصورت لگتی ہیں، کئی کمروں کی چیزوں کے ساتھ پتھر کا خوبصورت کام کیا گیا ہے۔محل میں بے شمار راہ درباری، بے شمار سیڑھیاں،

نیچے اترتی اوپر جاتی کئی منزلیں ہیں۔ہر کمرے میں بڑی بڑی مصوری کے شاہکار آویزاں ہیں۔مختلف موقعوں کے حوالے سے،خوبصورت نظاروں سے اور سلاطین کے حوالے سے یہ تصویریں آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہیں۔

محل کا سب سے پرانا قالین **193** سال پرانا ہے۔اطلس کے بھاری پردوں کے ساتھ بعض کمروں میں لیس کے خوبصورت پردے لٹک رہے ہیں۔ چند کمروں میں نوادرات رکھے ہیں، جو سلطان استعمال کرتے تھے۔ان میں چاندی،چینی اور سونے کے بڑے خوبصورت برتن ہیں۔چین، روس،فرانس اور چیکوسلواکیہ سے لائی ہوئی کٹ گلاس، چینی، چاندی اور دوسری دھاتوں کی بے شمار چیزیں ہیں، قہوہ اور شراب کے گلاسوں پر سونا چڑھا ہوا ہے۔ کنگھی، برش، پاؤں صاف کرنے کا جھاواں، صابن دانی سب پر سونا یا چاندی یا پتھروں سے کام کیا گیا ہے۔سگریٹ کیس، شمع دان اور آرائش کے مختلف ڈبوں پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔سلطان کا تخت بھی مرجع ہے۔کامدانی اور سنہری کام ہے۔بے شمار راہ دریاں ہیں، بے شمار منزلیں ہیں، بے شمار راستے ہیں۔آخر **365** کمروں کے اس محل کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ایک شیشے کا بڑا خوبصورت زینہ اوپر جاتا ہے جو سلطان کی نشست گاہ ہے۔وہاں وہ مہمانوں کا خیر مقدم کرتا تھا۔ یہاں ایک خوبصورت پیانو بہت بڑا پڑا ہوا ہے، یہ روس کے زار کا تحفہ ہے۔ایک بہت بڑا کلاک بھی ہے جس کا محراب بہت بڑا ہے، اور لکڑی کے ایک منقش چبوترے پر پڑا ہوا ہے۔ یہ مصر کے بادشاہ کا تحفہ ہے۔ ہاتھی دانت کی دو بڑی خوبصورت محرابیں کالی آبنوس کے ساتھ آرائش کی دیکھنے والے کی توجہ لیتی ہیں اور چاروں طرف مختلف مصوری کے شاہکار ہیں۔

یہاں سے تھوڑے فاصلے پر وضو اور نماز کا کمرہ ہے۔ وضو کیلئے بڑے بڑے سنگ مرمر کے کام نلکوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔نماز کے کمرے میں قرآن مجید کے نادر نسخے، جائے نماز، قرآن مجید رکھنے کے لئے بڑی چھوٹی ریلیں اور بیٹھنے کے لئے

چوکیوں کا فرش ہے۔ نیچے خوبصورت قالین ہیں، کمرے میں چاروں طرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے پاک نام سنہری حروف میں کنداں ہیں۔ رمضان میں افطار اور سحر کے لئے الگ الگ نشست گاہیں ہیں۔ عید پر احباب اور لوگوں سے ملنے کیلئے بھی الگ ہال ہیں۔ جن میں مصر کا سنگ مرمر استعمال ہوا ہے۔ بچوں کے کمرے بھی یہاں ہیں۔ جنکے ساتھ اُس کے اتالیق کی رہائش گاہ ہے۔ اس دور میں اتالیق کا درجہ بہت اونچا تھا۔ اسکی رہائش بھی محل میں ہوتی تھی۔ تخت کے آئندہ وارث کو امور سلطنت کیلئے تیار کرنا کوئی چھوٹا مرحلہ نہیں تھا۔ یہاں محل میں مسجد بھی ہے۔ جہاں اہل خانہ نماز ادا کرتے تھے۔ استاد کے کمرے میں کتابوں کے علاوہ ضرورت کی ساری چیزیں ہیں۔ لگتا ہے ابھی ابھی استاد یہاں آکر اپنے شاگرد کو پڑھائے گا۔

......☆......☆......☆......

یہاں سے محل کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جسے ''حرم'' کہتے ہیں۔ اور جس کا تقدس بہت اہم تھا۔ سلطان کے محل میں ولی عہد کی ماں کا درجہ بہت اونچا تھا اور حرم کی ساری ذمہ داری خدمت گاروں کے ساتھ اس پر تھی۔ حرم اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک طویل راہ دری سے ساتھ نیلگوں سمندر کا نظارہ بہت دافع نظر آتا ہے۔ اس راہ دری میں نیلے شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جن سے حرم کی بیگمات نیچے مہمانوں کے ہال میں تقریبات کا سارا حال دیکھ سکتی تھیں۔ خواتین کو مردوں میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن وہ سب کچھ دیکھ ضرور سکتی تھیں۔ حرم کی 7 خواب گاہوں میں ایک کمرہ سلطان کی خواب گاہ ہے۔ کمرے میں قیمتی فرنیچر پڑا ہوا ہے۔ اطلس کے کور ہیں اور چوڑی چھپر کھٹ پر جالی کی مسہری لٹک رہی ہے۔ بھاری فرنیچ سائن کام والا بیڈ کور پڑا ہوا ہے۔

سلطانوں کا دور ترکی میں 1299ء میں شروع ہوا، اور 1924ء میں کمال اتاترک کے انقلاب سے ختم ہوا۔ جس کے بعد ترکی میں بادشاہت ختم ہوگئی۔ اور جمہوریت آگئی۔ پبلک کے نمائندے حکمران بن گئے۔ رومن کی حکومت 1453ء میں

پوری طرح ختم ہوگئی۔انہوں نے بھی 10 صدیوں تک اس سرزمین میں حکومت کی۔اس لئے ابھی بھی ان کے بے شمار نشان ابھی بھی موجود ہیں۔محل کے تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔سلطان کی نشست گاہیں۔سرکاری امور کیلئے محل کی نشست گاہیں اور حرم جو بیگمات اور بچوں کیلئے مخصوص تھا۔

اتاترک ترکی کے پہلے صدر تھے، وہ 15 سال اس محل میں مقیم رہے۔محل کے ہال میں ان کی وہ تقریر ابھی بھی کنداں ہے جو پہلے صدر کی حیثیت سے انہوں نے کی۔اس ہال میں وہ مشہور فانوس بھی ہے جو ترکی کے سلطان نے آرڈر پر انگلینڈ سے 1853ء میں بنوایا، جس پر 790 شیشے کے بال ہیں اور جس کا وزن 45 ٹن ہے۔انقرہ استنبول سے 600 کلومیٹر دور ہے۔ترکی کا دارالخلافہ ہے اور اتاترک کی آخری آرام گاہ۔اتاترک کی کوئی اولاد نہیں تھی۔اُن کی شادی صرف دو برس تک رہی۔اس کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی۔ایک بہن کا انتقال جلدی ہوگیا تھا۔دوسری کا کبھی کسی نے نہیں سنا۔ اتاترک کو ماڈرن ترکی کا باپ کہتے ہیں۔اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ''وہ 60 ملین ترکوں کے باپ ہیں۔'' یہاں کوئی ان پڑھ نہیں، بنیادی تعلیم 8 سال تک حاصل کرنا پڑتی ہے۔30% لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔تعلیم مردوں میں 90% ہے۔عورتوں میں 60% دیہاتوں میں عورتیں زیادہ نہیں پڑھتیں، بے روزگاری کی شرح 25% ہے۔کئی ادارے حکومت کی تحویل میں ہیں۔کئی پرائیویٹ ادارے بھی ہیں۔جسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ملک میں قانون کی بالادستی ہے۔پولیس کو بہت اختیارات ہیں اور امن وامان رکھنے ہیں۔مثالی کردار ادا کرتے ہیں: جرائم برائے نام ہیں لوگ امن سے رہتے ہیں۔

سلطان کا یہ محل پُرشکوہ ہے محل کے باغ میں داخل ہوتے ہی کلاک ٹاور ہے۔باہر مسجد ہے: ساتھ مرمرا سمندر کی نیلاہٹ ہے مرمرا کا نام ماربل سے لیا گیا ہے۔اس محل کی آن بان دیکھ کر صدیوں پہلے کا زمانہ گلیوں میں گھوم جاتا ہے۔یہ شان وشوکت یہ جلال

اور فراوانی وقت کے تیز ہاتھوں عہد رفتہ سے وابستہ ہو گئے ہیں یہ دنیا کی بے ثباتی ہے اور ہمارے لیے ایک سبق جو زندہ ہیں۔اور یہ سب دیکھتے ہیں لیکن دنیاوی زندگی میں دوام نہیں۔اصل زندگی تو آخرت ہے۔دنیاوی عیش وعشرت بھی اللہ ہی کی نعمت لیکن یہ بھی ہے کہ زندگی میں اچھے کام کرتے جائیں کیونکہ یہی یاد رہ جاتی ہے۔استنبول میں 6 یونیورسٹیاں ہیں امیر طبقہ باسفورس کے کناروں پر رہتا ہے۔غریب طبقہ باسفورس کے پار رہائش پزیر ہے اور سلطانوں کے دور میں یہ علاقہ امیر لوگوں کے لئے مخصوص تھا باسفورس پر چار پل بنے ہوئے ہیں۔ہر طرح کے جہاز بڑے چھوٹے ہر ملک سے آتے جاتے ہیں سمندر کا یہ حصہ بہت اہم اور تاریخی نوعیت کا ہے ایشیا اور یورپ کو بھی ملتا ہے استنبول میں 18 یا 19 سیاسی پارٹیاں ہیں جن میں 8 پارٹیاں زیادہ اہم ہیں اسوقت ایک قانون صدر ہیں۔

سمندر کے کنارے اونچائی پر ایک پہاڑی ہے جس کا نام cahica ہے یہاں سے سارا استنبول، پرانا اور نیا نظر آتا ہے۔اونچے نیچے مکان کچھ نئے اور کچھ پرانے۔پھر سارے شہر میں پھیلی ہوئی 2000 مسجدوں کے گنبد سرسبز روشوں پر ساتھ ساتھ ریسٹورنٹ ہیں۔جہاں لوگ نظارے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔

یہاں سمندر کے ساتھ ایک اور پہاڑی پر ایک چھوٹا سا میوزیم ہے جو انیسویں صدی میں ایک فرانسیسی شاعر کی رہائش گاہ تھی۔اُسے استنبول بہت پیارا تھا۔اور وہ کافی وقت یہاں گزارتا تھا۔یہاں ایک پرانی لائبریری بھی ہے۔ساتھ ہی اٹھارویں (18) صدی کی ایک نہایت خوبصورت مسجد بھی ہے۔جو یہاں کے ایک مشہور سنگ تراش جس کا نام SINAW تھا۔نے اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد خود بنوائی۔جس کی عمر صرف 22 برس تھی۔اس مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑی لائبریری ہے۔غریب لوگوں کیلئے ایک کچن بنا ہوا ہے جس میں اس زمانے میں باقاعدہ روز غریبوں کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔یہاں سلطان محمد کا مقبرہ بھی ہے۔ترکی حمام بھی ہیں جو پرانی دیواروں اور بڑے بڑے پتھروں کے خوبصورت زاویوں کے ساتھ ابھی بھی استعمال میں ہیں۔عورتوں اور مردوں کے الگ

الگ حمام ہیں ۔ 300 صدی پرانے حمام ترکی کے رہنے والوں کیلئے اور باہر سے آنے والوں کیلئے بڑے پرکشش ہیں۔

استنبول میں ''سلیمانی مسجد'' جو سلطان سلیمان نے بنوائی اور جس کا بنانے والا وہی مشہور سنگتراش تھا۔ جس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی بے وقت موت کے بعد خود بھی ایک مسجد بنائی تھی۔ سولہویں صدی کی یہ پرشکوہ مسجد کو وسیع ہال جس کی چھت بہت اونچی ہے۔ اس دور کی ثقافت کی عکاسی کرتی ہے۔ باغ میں سرو کے بلند قامت درخت ہیں۔ اس دور میں ترکی کے سلطانوں کا عروج تھا۔ ہال میں بڑے بڑے ستون ہیں جنکی لمبائی 27 میٹر سے 48 میٹر تک ہے۔ شمع دان بڑے خوبصورت ہیں۔ ساری مسجد میں قالین پڑے ہیں جو ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں۔ منبر کی جگہ اور مؤذن کی جگہ بہت اونچی ہے۔ قرآنی آیات کنداں ہیں۔ چھت پر میناکاری ہے بہت اونچا گنبد ہے۔ ساتھ دوسرے گنبد بھی ہیں۔ کھڑکیوں پر نیلا شیشہ اور دوسرے رنگوں کے شیشوں کو کاٹ کاٹ کر بڑا خوبصورت کام کیا گیا ہے کہتے ہیں اس زمانے میں ایک کاریگر جس کا نام ابراہیم تھا۔ اس نے دن رات کی محنت سے اس مسجد کی کھڑکیاں بنائیں۔ حالانکہ جب بن رہی تھی تو سلطان کے پاس فنڈ کم پڑ گئے اور تھوڑی دیر کیلئے کام التوا میں پڑ گیا۔ شاہ ایران نے بہت سے ہیرے جواہرات یہ کہہ کر سلطان کو بھجوائے کہ انہیں وہ استعمال میں لائے لیکن سلطان نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا شاہ کا تحفہ واپس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سارے ہیرے جواہرات مسجد کے چوتھے گنبد میں ڈال کر بند کر دیئے۔ گویا اس مسجد کے ایک گنبد میں ایک ضخیم خزانہ مدفن ہے۔ یہ مسجد 1550 میں بننا شروع ہوئی اور 7 سال کی مدت میں تیار ہوئی۔

ترکی کے سلطانوں کا Top Polace بھی ایک منفرد اور تاریخ کے خزانوں کے ساتھ دعوت نظارہ دیتا ہے۔ باہر پرانے وقت کے آثار ہیں ۔ جہاں سے پانی

فواروں کی صورت میں باہر آتا ہے۔ سرد اور بلند قامت درختوں کے راہ ریزوں سے گزر کر سلطان کا محل آتا ہے۔ ایک دیوار کے ساتھ جیل کی پرانی عمارت ہے۔ اس سے پہلے کمال اتاترک کا مجسمہ ہے جو ترک قوم کیلئے فخر اور عزت کی نشانی ہے سمندر کے نیلگوں پانی میں چھوٹے جزیرے بڑے دیدہ زیب لگتے ہیں۔ سفید اور نیلے پرندوں کے غول سمندر کے نیلگوں پانی پر اُڑتے ہیں ۔ اس محل کے ایک حصے میں مشہور فلم From Russia with love کی شوٹنگ بھی ہوتی تھی۔ محل کی عمارت سے پہلے باغ کے چار مختلف حصے عبور کرنا پڑتے ہیں۔ سرسبز روشیں بلند قامت درخت۔ پھولوں کے لیے بڑے بڑے مٹکے نما گلدان۔ محل میں داخل ہوتے ہی کلمہ طیبہ کے ساتھ مختلف سلطانوں کے دستخط سنہری حروف میں لکھے نظر آتے ہیں۔ اونچائی پر بنا ہوا یہ محل بڑا پرشکوہ ہے۔ استنبول کا پورا شہر 7 چھوٹی موٹی پہاڑیوں پر بنا ہوا ہے۔

محل کا نام ''توپ'' پر لکھا گیا ہے۔ دراصل یہاں ایسے مورچے باہر کی فصیل پر بنے ہوتے ہیں۔ جہاں سے جنگ کے دنوں میں کام لیا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں اور سلطانوں کا سب سے اہم کام فتوحات اور اپنے علاقے کی توسیع تھی۔ اس لئے اس دور میں بھی پسماندہ عوام پستے ہی رہے۔ امرا کا دور تھا کبھی کبھی کسی اچھے بادشاہ کو عوام کا بھی خیال آ جاتا تھا۔ ورنہ وہ بادشاہوں کا دور تھا۔ جیل کے ساتھ ہی ایک حمام ہے، نلکے لگے ہوتے ہیں یہ جلاد کیلئے مخصوص تھا۔ جب وہ پھانسی ہر ملزم کو چڑھا دیتا تو یہاں منہ ہاتھ دھوتا۔ معلوم نہیں کتنے بے گناہ لوگوں کا خون یہاں بہایا گیا کیونکہ پھانسی کی سزا معمولی باتوں پر بھی مل جاتی تھی۔ سلطان کی ذرا سی مخالفت، بادشاہی احکام کی ذرا سی غفلت لوگوں کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیتی تھی۔ سلطانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ایک رہائش گاہ ایسی دیکھی جو سلطان ـــــ نے اپنی بیٹی کو

شادی میں دی۔اس کا داماد اسکا وزیر تھا۔سلطان اور بیٹی کے ہاں بیک وقت بیٹے تولد ہوئے۔کچھ عرصہ کے بعد دونوں نے ان کی ''رسم ختنہ'' ادا کی۔اس رسم کو شان وشوکت اور ضیافت سے منایا جاتا تھا۔سلطان کو کسی نے کہا کہ آپ کے داماد نے اپنے بیٹے کی رسم ختنہ آپ سے زیادہ شاندار طریقے سے کی ہے۔سلطان نے داماد کو پوچھا،اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا'' آپ سلطان ہیں میں بھی آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔'' اگر کچھ بہتر کام کرلیا تو یہ آپ کی تربیت اور اثر ہے۔'' سلطان کا خیال تھا وہ انکار کرے گا۔ سلطان اس جواب سے سیخ پا ہوگیا اور اسی وقت جلاد کو اس کا سر قلم کرنے کو کہا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ بادشاہوں کا دور کیسا تھا؟ رشتوں کی یہ پہچان نہیں تھی، رشتہ صرف بادشاہت اور اقتدار کا تھا۔اس لئے اس دور میں ہر جگہ بھائیوں نے بھائیوں کو قتل کیا۔ دوسرے عزیز رشتہ دار کو راستے سے ہٹایا۔ بلکہ ایک رومن ملکہ Livia کے متعلق تو یہاں تک تحریر ہے کہ اس نے تخت حاصل کرنے کیلئے اپنے دو بیٹوں اور پوتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حالانکہ ماں کا رشتہ کسی بھی حیثیت سے لاثانی ہوتا ہے۔لیکن شائد ''اقتدار'' اور ''حکومت'' میں نشہ ہی ایسا ہے۔ پھر ان بادشاہوں کے محلات اور زندگی کی دوسری آرائش دیکھ کر واقعی انسان یہ سوچتا ہے کہ دنیاوی جاہ وحشمت میں بے تحاشہ کشش ہے، اور سب کچھ خش وخاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔

محل کے باہر ایک چرچ بھی ہے۔آخر رومن اور عیسائیوں کی حکومت بھی تو یہیں تھی۔ بڑی بڑی بارہ دریاں ہیں، اور شہر کی پرانی فصیل کی موٹی اور چکور پتھروں کی مضبوط دیوار محل سے ذرا دور نظر آتی ہے۔

ترکی کی حکومت کو بڑا عروج حاصل ہوا۔1453ء میں عیسائیوں کی حکومت

ختم ہوگئی۔استنبول فتح ہوا۔1517ء میں مصر فتح ہوا، 1526ء میں ہنگری فتح ہوا، پھر یورپ کے دوسرے ملحقہ ملک بھی فتح ہوئے اور سلطانوں کی حکومت یورپ اور ایشیاء میں ایک مؤثر اور پرشکوہ سلطنت بن گئی۔سلطان سلیمان جسے ابھی بھی اعلیٰ ترین خطاب سے نوازا جاتا ہے اور جسکی حکومت 1566 ۔ 1520ء تک رہی اس کے دور میں سلطنت عروج پر تھی۔ ایشیاء افریقہ اور یورپ کے کئی ملک سلطنت ترکیہ کے قبضے میں تھے لیکن 1699ء میں اس سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔سلطان صرف ''حرم'' کا ہو کر رہ گیا۔عورت، شراب اور عیش وعشرت کو اپنی زندگی بنا لیا۔وزیر اعلیٰ کے پاس سارے حکومت کے اختیارات چلے گئے۔آہستہ آہستہ مفتوح علاقے ہاتھ سے نکل گئے اور سلطنت عثمانیہ صرف ترکی کے اپنے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔انیسویں صدی میں ترکی کے سلطان مغربی طرزِ زندگی اپنانے لگے۔اپنی قدریں آہستہ آہستہ گم ہوگئیں۔ لباس، رہن سہن میں مغرب کا اثر آنے لگا۔عوام اس طرح اپنی قدروں کے ساتھ زندگی گزارتے رہے لیکن سلطانوں کے محلات میں مغربیت آگئی مغربی ممالک میں بھی جانے لگے اور وہاں کا رہن سہن اس کی روزمرہ کی زندگی میں جھلکنے لگا۔

یہ محل 780 سکوئر میٹر کے رقبے میں بنا ہوا ہے۔کھلے اور کشادہ باغ کے کئی حصے جن کے بیچ وبیچ اس دور کی راہ دری ہے۔کالے چھوٹے پتھروں سے تراشا ہوا یہ راستہ جس کے چاروں طرف اونچے درخت، پھولوں کی کیاریاں اور سرسبز گھاس کے قطعے ہیں، محل کی طرف جاتا ہے۔محل کی فصیل کے ساتھ سمندر ہے اور کچھ دور شہر کی پرانی فصیل جو یقیناً حفاظت کے طور پر بنائی گئی ہوگی۔سمندر میں ہر ملک کے درجنوں جہاز نظر آتے ہیں۔ پرانے دور میں بھی ایسا ہی ہوگا۔صرف جہازوں کی ساخت میں فرق ہوگا۔جانوروں کے ماربل میں مجسمے اور پھولوں کیلئے بڑے بڑے مٹکے دیدہ زیب

ہیں۔طویل اور عریض باغ کے بعد محل کی عمارت ہے۔سب سے پہلے ''کلاک ٹاور'' ہے جس پر ایک خوبصورت مینار پر بہت بڑا کلاک ہے۔سپاہیوں کیلئے جگہ ہے جو ڈیوٹی بدل کر دن رات یہاں موجود ہوتے ہونگے۔محل کے کئی حصے ہیں۔سلطان کی نشست گاہ ساتھ راہ داریاں، برآمدے، اونچے ہال، بڑی بڑی کھڑکیاں، اِدھر اُدھر جاتے آبنوس کی لکڑی کے چوڑے اور کشادہ زینے۔سب محل کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔چھت اور دیواروں پر بڑی خوبصورت نقاشی ہے۔مختلف رنگوں میں یہ نقشی کام کاریگروں کی مہارت کا ثبوت ہے۔جو دنیا کے مختلف ملکوں سے سلطان انہیں یہاں کام کیلئے لے کر آتے تھے۔

داخل ہوتے ہی خانہ کعبہ کا دروازہ ہے۔قرآنی آیات اور کلمہ لکھا ہوا ہے، ساتھ مسجد ہے گویا شاہی خاندان اور انکے مہمانوں کیلئے نماز کی جگہ ہے۔قرآن مجید کے نادر نسخے اور دوسری مذہبی کتابیں پڑی ہیں۔بڑے بڑے فانوس لٹکے ہوئے ہیں۔

ایک کمرہ میں صرف گھڑیاں اور کلاک پڑے ہوئے ہیں۔**16** صدی عیسوی میں فرانس کی حکومت سے تحفہ میں دیا ہوا ایک کلاک ہے۔یہاں کے بنے ہوئے کلاک **17** صدی میں استعمال ہوئے۔جیب کی گھڑیاں، چھوٹی گھڑیاں، بڑی گھڑیاں جن میں ہیرے جواہرات اور سونے کی زنجیریں لگی ہوئی ہیں۔اس دور کی عکاسی کرتی ہیں۔**1839**ء میں ایک تحفہ میں دیا ہوا ایک کلاک بڑا خوبصورت ہے۔یہ بھی فرانس کا تحفہ ہے۔محل کے دوسرے کمروں میں جو لاتعداد ہیں۔دنیا کے مختلف ممالک اور ترکی کی اپنی مصنوعات کی بڑی خوبصورت نمائش ہے۔سلطان محمود جس نے **1730-54**ء تک حکومت کی، کے دور کا ایک تخت بھی دعوت نظارہ دیتا ہے۔جو ہندوستان کے فاتح نادر شاہ نے ترکی کے سلطان کو تحفہ میں دیا، اس کا کام صریحاً برصغیر کے کاریگروں کا ہے۔

اس کے اوپر لکھا بھی ہوا ہے کہ ہندوستان اور ایرانی کاریگروں نے مل کر بنایا۔عنابی، سبز حاشیے کے ساتھ سنہری اور موتیوں کا کام بالکل برصغیر کی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔

1639ء میں سلطان مراد نے بغداد فتح کیا۔اس کی یاد میں اس نے محل میں ایک بہت بڑا مینار بنوایا۔بہت بڑا گنبد ہے۔دنیا کے مختلف ملکوں سے لائی گئی مٹی اور پتھر یہاں استعمال ہوئے ہیں۔دیواروں پر باریک نقاشی ہے۔چھت بہت اونچی ہے۔پرانے قالین پڑے ہوئے ہیں۔فانوس لٹک رہے ہیں باہر فوارے ہیں۔ساتھ بہت بڑا کچن ہے۔شمع دان ہیں۔**18** صدی میں یہ مینار سلطانوں کی لائبریری کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔اب یہاں کتابیں موجود نہیں۔وہ شہر کی لائبریری یا دوسری جگہوں پر منتقل کر دی گئی ہیں۔یہاں قریب ہی سنگ سفید اور پتھروں کی ایک بارہ دری ہے۔جہاں سلطان روزہ افطار کیا کرتے تھے۔سامنے مرمرا سمندر کا دل افروز نظارہ ہے۔پیچھے محل کے خوبصورت باغات کے اونچے اونچے درخت اور محل کی پرشکوہ عمارت، افطار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہوگا۔

......☆......☆......☆......

سولھویں صدی کا ایک مرصع ہیرے جواہرات سے تخت بھی پڑا ہوا ہے۔ سنہری حاشیوں والا یہ تخت الف لیلے کی کوئی داستان معلوم ہوتا ہے۔ 1789ء سے 1807ء کے دور کے سلطان کی تخت پوشی کی ایک بہت بڑی مصوری کی نادر تصویر پڑی ہے۔ سلطانوں کے دور میں سلطان محمد جس کا دور 1648-1686 تک تھا کی بڑی نایاب ذریں موجود ہیں۔ سلطان ابراہیم کے دور کا ایک مینار ہے۔ جس پر فتوحات کا ذکر ہے۔ محل کے ساتھ ہی شاہی طبیب کی رہائش گاہ ہے۔ ظاہر ہے طبیب کا قرب تو ضروری تھا۔ اور کوئی خاص طبیب ہی سلطان کے تخت کے لئے مامور ہوگا۔ جس پر اعتبار بھی کیا جاسکتا ہو۔ محل کے بے شمار کمروں میں وہ اشیاء نمائش کے طور پر پڑی ہیں۔ جو یہ اس دور کے سلطان استعمال کرتے تھے۔ سونے، ہیرے قیمتی موتیوں کے بے پناہ مالیت کے بے شمار زیورات ہیں۔ مرصع خنجر ہیں۔ مرصع تلواریں ہیں ایک بڑا سا تھال مختلف قسم اور رنگوں سے بھرا ہوا لوگوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے خاص موقعوں پر سلطان اپنے مداحوں اور عزیز رشتہ داروں کو ہیرے جواہرات کا تحفہ

دیتے تھے۔ کنگھی، برش، صابن دانیاں سب ہیرے جواہرات اور سونے سے جڑے ہوئے ہیں۔ سلطان مراد جس نے 1574-95 تک حکومت کی اس کا ایک بکس قیمتی پتھروں سے جڑا ہوا موجود ہے۔ استعمال کے بعض برتنوں پر بھی سونا اور چاندی چڑھا ہوا ہے۔ نایاب چینی کے برتن جو دنیا کے مختلف ملکوں سے منگوائے گئے یہاں موجود ہیں۔ بیل بوٹے، نقاشی اور رنگوں کا امتزاج بہت خوبصورت ہے۔ نشست گاہوں میں قیمتی کپڑے کے گدے، گدیاں اور بیٹھنے کی چوکیاں اور صوفے ہیں۔ قالین جن پر چلنے کی اجازت نہیں، بہت دیدہ زیب رنگوں میں نہایت نفاست سے بنے ہوئے ہیں۔ پردے کمخواب کے ہیں لیس کا استعمال بھی ہوا ہے اور قیمتی ریشم کا بھی۔ ان چیزوں کی نگہداشت کیلئے حکومت نے ایک الگ محکمہ قائم رکھا گیا اور یقیناً یہاں بے شمار سٹاف ان کا کام کرتا ہے۔ سیاحوں کا رش بھی دنیا کے سارے ملکوں سے سارا سال رہتا ہے۔ چینی کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مٹکے، گلدان، شمع دان اور آرائش کی چیزیں ہیں۔ بعض برتن صرف ایک ٹکڑے سے بنے ہوئے ہیں۔ جو نایاب اور نا قابل یقین ہے۔ مرصع قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کا پاک نام اور اس کے حبیب کا مقدس نام بھی لکھا ہوا ہے۔

لمبی اور نا ختم ہونے والی راہ داریاں ہیں، باغ کے کئی حصے ہیں۔ چھوٹے بڑے جہاں بھول بھلیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور میں بے شمار ملازمین ہونگے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہونگے۔ جو محل کے مکینوں اور آنے والوں کا خیال رکھتے ہونگے۔ پھر حفاظت کے لئے جو عملہ ہوگا وہ بھی ہزاروں میں ہوگا۔ سلطانوں کو ہر وقت اپنی زندگی کا خطرہ رہتا تھا۔ دشمن سے چوکس رہتے تھے۔ اسلئے بھی لاتعداد کمرے سٹاف کیلئے موجود ہیں۔ محل کے ایک طرف شاہی باورچی خانہ ہے۔

برتن آجکل کے زمانے کی طرح ہیں۔ بڑے بڑے پتیلے، کڑاہیاں، پرات، پکانے کے چمچے، سِل، چمٹیاں اور چولہے اس دور میں لکڑی جلتی تھی۔ اور پتھر کا کوئلہ استعمال ہوتا تھا۔ اسی سردی میں محل کے اتنے کشادہ اور اونچی چھتوں والے کمرے گرم رکھنا آسان نہیں ہوتے ہونگے۔ کہتے ہیں کچھ ایسا بندوبست تھا کہ محل کے نیچے گرم پانی نالوں میں اس طرح آتا تھا کہ کمرے گرم رہتے تھے۔ اس کے علاوہ مٹی کے تیل کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ **1912**ء میں پہلی ہیٹنگ کا بندوبست ہوا، لیکن اس سے پہلے بھی یہ لوگ ایسا بندوبست ضرور رکھتے ہونگے کہ سردی کی شدت سے محفوظ رہیں۔

استنبول میں اگر سینٹ صوفیہ چرچ کو نہ دیکھا جائے تو سلطنت عثمانیہ کی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ یہ پرانا چرچ سب سے پہلے **323** ق م میں عبادت کے لئے بنایا گیا **404** ق م میں رومنز نے اسے دوبارہ بنایا اور **415** ق م میں پھر از سرنو تعمیر کیا، لیکن رومنز کی عظیم فتوحات کے بعد جب انہوں نے عیسائیت قبول کر لی تو **Justiniau** نے **6** صدی ق م میں اس شاندار چرچ کی نئے سرے سے تعمیر کی۔ عرصہ تک یہ دنیا کا سب سے بڑا چرچ شمار ہوتا یا پھر اس سے بڑا چرچ روم میں سینٹ پیٹر بنا۔ دوسرا بڑا چرچ لندن میں بنا اور تیسرا میلان اٹلی میں، لیکن اس کو پھر بھی چوتھے بڑے چرچ کا درجہ ہمیشہ حاصل رہا **7590** سکویر میٹر پر بنا ہوا یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد عمارت ہے روم شہنشاہ **Justinan** کی ماں کا نام صوفیہ تھا۔ اور اُس نے اُس کے احترام میں یہ چرچ بنایا صدیوں تک یہ چرچ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ قائم رہا۔ جب **1453**ء میں ترکوں نے ترکی فتح کیا تو اس چرچ کو اُنہوں نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ سلطان محمد **V** نے یہ فتح حاصل کی اور اُسی نے اس چرچ کو مسجد بنانے کا حکم دیا اور چرچ میں دو اور مینار بنوائے۔ عام طور پر فاتحین دوسرے مذہبوں کی عبادت گاہوں کو اپنی عبادت گاہ

میں تبدیل نہیں کرتے لیکن اس چرچ کا چرچا اتنا تھا شہرت اتنی تھی کہ ترک شاید اس بات سے خائف تھے کہ عیسائیوں کی اتنی مشہور عبادت گاہ اُس ملک میں ہے جس کے وہ مالک تھے چنانچہ اُنہوں نے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا حلانکہ اور بھی کئی چرچ استنبول میں موجود تھے اُنہوں نے انہیں نہیں چھیڑا۔ یہ مشہور عمارت تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے باغ کے ساتھ دونوں طرف گیلریاں ہیں اور راہ داریاں ہیں صدیوں تک یہ چرچ استنبول کی سب سے بڑی مسجد کے طور پر بنا۔ لیکن جب اتاترک نے **1923** میں یہاں جمہوریت بحال کی تو اُس نے اس مسجد کو استنبول کی لائبریری اور میوزیم بنا دیا۔ سلطانوں نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ اور اُس دور کی وہ ساری تصویریں جو چرچ کی دیواروں پر بڑے کاریگروں نے بنائی تھیں ڈھانپ دیا تھا خاص مصالحے سے وہ دیواریں صاف کر دی گئی تھیں۔

اتاترک کے حکم سے وہ ساری تصویریں پھر باہر لٹکائی گئیں اور اب اس عظیم عمارت میں عیسائیت کے دور کی ساری تصویریں موجود ہیں: ایسے اعلی رنگ اور ایسی اچھی گلکاری کی گئی ہے کہ صدیوں تک روپوش رہنے کے باوجود اور چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی دیدہ زیب ہیں چرچ کے سب سے بڑے ہال کے ایک کونے میں حضرت مریم کی حضرت عیسیٰؑ کے بچپن کی ایک نہایت خوبصورت قد آور تصویر ہے۔ اب تو رومنز کے زمانے کی وہ ساری تحریریں جو پتھروں پر کنداں ہیں لوگوں کے دیکھنے کے لیے موجود ہیں بڑے بڑے بھاری پتھر اُس کی دیواریں بھاری پتھر اور مٹی کے برتن اور مٹکے شمع دان سب پڑے ہوتے ہیں عمارت بے شک مسجد میں تبدیل ہوئی۔ لیکن بنوائی تو رومنز نے تھی یقین نہیں آتا کہ صدیاں گزر گئی ہیں اور ابھی تک اسی مضبوط حالت میں ہے بڑے بڑے دروازے ہیں۔ بھاری لکڑی کا استعمال ہے پتھر زیادہ تر مصر سے درآمد ہوا تھا

دو بڑے گیٹ ہیں ایک شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا اور ایک عوام کے لیے پردوں کے لیے لوہے کے بڑے بڑے کنڈے دروازوں پر لگے ہوئے ہیں یونانی اور رومنز دروازوں پر بھاری پردے استعمال کرتے تھے۔ جن کا ظاہر ہے اب کوئی نشان باقی نہیں۔ اس دور میں یہاں یونان کی تہذیب کا بھی بہت دخل تھا اور لوگوں کے رہن سہن پر وہ اثر انداز تھے عمارت کے ہال میں **40** بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں اوپر راہ داری ہے جو صفائی اور دیکھ بھال کے لیے استعمال ہوتی ہوگی۔

ہال کے میناروں کی لمبائی **32** سکوائر میٹر ہے اور سب سے بڑے کی لمبائی **58** سکوائر میٹر ہے مسجد میں بڑے بڑے مٹکے وضو کے لیے پڑے ہوئے ہیں جو روایات کے مطابق مصر سے لائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک نام رسول پاک کے نام اور قرانی آیات لکھی ہوئی ہیں شمعدان پڑے ہوئے ہیں دیے جلانے کے لیے بھی جگہ ہے۔ عورتوں کے لیے نماز کی الگ جگہ ہے ۔ چھت وہی صدیوں پرانی ہے اُسے سلاطین نے نہیں بدلا تھا۔ بہت خوبصورت اُسی دور کے نقوش مختلف رنگوں میں بیل بوٹے جو عرصہ گزر جانے کے باوجود مدھم نہیں ہوئے **1736** ء میں اسی عمارت کے ایک حصے میں سلطان محمود نے ایک بہت بڑی لائبریری بنائی سلطان کا کمرہ اُسی شکوہ کے ساتھ عوام کو باہر سے دکھایا جاتا ہے مگر مچھ کی جلد سے بنی ہوئی آرائش کی بعض چیزیں ہیں ۔ قرآن پاک کے نسخے پڑے ہیں ۔ بیٹھنے کے لیے فرشی بندو بست ہے ۔ چوکیاں پڑی ہیں اُس دور کا قالین پڑا ہے۔

بڑے ہال میں ایک طرف وضو کی جگہ ہے۔ میز ہے مؤذن کی جگہ ہے اور خطیب کے لئے ایک اُونچا مینار بنا ہوا ہے۔ پانی کا انتظام زمین دوز اُس دور میں نہیں تھا۔ **700** ق م سے **300** عیسوی تک رائج رہا۔ اس میں مصر کے کاریگروں نے بہت

کام کیا۔ ترکی کی تاریخ **700** ق م سے محفوظ ہے۔ اس زمانے میں یہاں یورپ کی تہذیب اثر انداز نہیں ہوتی تھی لیکن اب نئے اور پرانے یورپ کی تہذیب اگر اثر انداز میں ہوتی تھی لیکن آپ نئے اور پرانے یورپ کو خلیج فاسفورس نے تقسیم کر دیا ہے۔ ترکی دور جدید کا ایک ملک ہے پرانے شہر میں خواتین کا ایک شاپنگ سنٹر ہے جو زمانہ قدیم میں خواتین کی جیل تھی۔ اُتاتُرک نے یہاں شاپنگ سنٹر بنانے کو کہا اچھا ہوا کہ ایسی جگہ جہاں جانے کتنی بے گناہ خواتین کو عمر قید دوسری صعوبتوں سے گزرنا پڑا ہوگا خواتین کا پلازہ قائم ہے۔

بلیو مسجد

سلطان احمد جس نے **1609** ء میں اس مسجد کی تعمیر کی **5280** سکوائر میٹر کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے: اور دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اس مسجد کو بلیو مسجد کہتے ہیں کہ اس حال میں نیلے رنگ کے شیشے کا بہت استعمال ہوا ہے۔

چھوٹے بڑے نیلے زیادہ اور دوسرے رنگ کے شیشے سے بڑی خوبصورت کھڑکیاں ہیں چھت پر مینا کاری میں بھی نیلا رنگ زیادہ ہے۔ چوڑے برآمدے کے بعد مسجد کا ہال ہے۔ پرانے قالین پڑے ہیں بڑے بڑے فانوس ہیں۔ قرآن مجید کے نسخے منبر پر مؤذن کی جگہ اور اللہ کے پاک نام اور رسولِ پاک اور خلیفوں کے نام لکھے ہوئے ہیں عورتوں کے لیے بھی نماز کی جگہ ہے ایک ہال کھلا ہے وہاں نماز ادا کرتے ہیں اندر کا ہال سلطان شاہی خاندان کے افراد امراء کے لیے وقف تھا اب ایسا نہیں ہے ویسے بھی اسلام میں سب برابر ہے اور ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود اور ایاز اسلامی تصور ہے۔

مسجد میں ایک طرف سلطان کی الگ عبادت گاہ ہے جسکی الگ کھڑکیاں ہیں اور دروازے گولڈن حاشیے سے بنے ہوئے ہیں بارہ دری بھی ساتھ ہے۔ مسجد کے ڈیزائن کا نام محمد آغا تھا۔ مسجد کے ساتھ لائبریری۔ سکول بازار اور ہسپتال بھی تھا۔ تا کہ آنے والوں کے لیے آسانی رہے۔ ویسے بھی زمانہ قدیم میں مسجد صرف عبادت گاہ نہیں تھی۔ بلکہ درس گاہ بھی تھی لوگوں کا عبادت کے علاوہ بھی بہت وقت یہاں گزرتا تھا۔ مسجد میں **20043** رنگ برنگی ٹائیلیں استعمال ہوئی ہیں سارے قالین **19** صدی کے ہیں۔ جو ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں بڑے بڑے مینار ہیں یہاں استعمال کیا گیا پتھر مرمرا کے سمندر سے لایا گیا ہے اس مسجد کی ساخت بہت حد تک سینٹ صوفیہ سے مشابہ ہے۔ ہوسکتا ہے سلطان نے جان بوجھ کر بھی اس کی نقل کی ہو کیونکہ وہ اپنے وقت کی ایک منفرد عمارت تھی۔ مسجد کے ہال میں ایک کونے کا نام ہا تھی کی ٹانگ ہے: دراصل اُس سے مشابہ یہ جگہ ہے اور اوپر سیڑھیاں جاتی ہیں۔ یہاں مؤذن اذان دیتا ہے۔ مسجد کے پچھواڑے میں سلاطین کا قبرستان ہے۔ **14** سے **16** صدی تک کے شاہی خاندان کے بے شمار لوگ وقت کے سلطان کے ساتھ محو خواب ہیں پڑھنے پر پتہ چلتا ہے۔ کہ ایک ایک سلطان کے درجنوں کے حساب سے بچے تھے۔ بے شمار عورتوں سے شادیاں کرتے تھے۔ بیک وقت غالباً چار بیگمات ہی نکاح میں ہوتی تھیں شاہی خاندان کا شہزادہ سلطان بنتا تھا۔ وہ دوسرے بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کو جینے اور اپنے سلطان بننے کا خوف ہوتا تھا ۔ مروا دیتے تھے یہ مسلمان بادشاہوں کا تاریخ میں المیہ رہا ہے۔ یہ تخت نشین کے لیے ان کے پاس کوئی واضح قانون نہیں تھا۔ اسلئے کشت وخون ہوتا۔ اور قابل سے قابل شاہی خاندان کے لوگ بے وقت موت کے اندھیروں میں چلے جاتے تھے

پندرھویں صدی کے آخر میں سلطان نے ایک قانون بنایا کہ بڑا بیٹا ہی تخت کا وارث ہوگا۔ اس سے خون خرابا کچھ عرصہ کے لئے ضرور رہا لیکن اُس کے بعد بادشاہت ہی ختم ہوگئی۔

یہاں ایک جگہ ایک نشان ایسا ہے جسے لوگ خوش بختی سے تعبیر کرتے ہیں کہتے ہیں سلطان احمد کے گھوڑے نے اس خاص جگہ جب فاتح کی حیثیت سے یہاں آیا تو اپنے اگلے قدم یہاں رکھ دیے تھے۔ یہاں ایک سوراخ بنا ہوا ہے۔ یہاں آنے والے لوگ اپنے ہاتھ کا انگوٹھا یہاں رکھ کر اپنا پورا ہاتھ گھماتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔ وہ پوری ہوجاتی ہے۔ توہمات سہی۔ لیکن ایسی باتوں میں افسانوی رنگ فردا ہوتا ہے۔

یہاں رومن دور کی وہ جگہ بھی ہے جہاں بادشاہ وقت تفریح کیا کرتے ہیں۔ جانوروں کی لڑائیاں۔ تھیٹر اکھاڑے اور دوسری کھیلیں ہوتی ہیں یہ سارا علاقہ موٹے پتھر کی موٹی دیواریں اور اُونچی چھت سے ڈھکا ہوا تھا۔ صدیوں پہلے ایک شدید زلزلے سے یہ عمارت گر گئی تھی اب صرف تین بڑے بڑے ستون اس جگہ ہیں ایک مینار مصر کی طرح یہاں بنایا گیا ہے۔ جو سفید سنگ مرمر کا بنایا ہوا ہے اُس شاہی خاندان کے لوگوں کے مجسمے ہیں۔ اوپر سے موٹے پتھر سے اس کو اور اُنچا کیا گیا ہے۔ دوسرا ستون کچھ فاصلے پر ہے وہ بھی بہت اُنچا ہے جو گیارھویں صدی میں بنا کہتے ہیں کہ پتھر اور سیمنٹ پر سارا تانبا چڑھا ہوا تھا جو بعد میں اُتار لیا گیا۔ اور اُس سے ہتھیار بنے۔ تیسرا ستون بھی عہد رفتہ کی یاد دلواتا ہے۔

یہاں سلاطین کے دور کا ایک میوزیم بھی ہے۔ جس میں صدیوں کی تاریخ محیط ہے۔ زمانہ قدیم کی چیزیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ مجسمے اور تصویروں سے اس زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ پرانے ترکی کے مردوں عورتوں کے لباس، شلوار، لمبی قمیصیں، سر

پر چھوٹا دوپٹہ، سر پر ٹوپی، گاؤں کی زندگی کا منظر، چرخہ کاتتی عورتیں، ہل چلاتے ہوئے مرد، خیموں میں رہائش، زمین پر سونے اور رہنے کا انداز، اس دور کے برتن، اوزار اور زندگی کے دوسرے عکس سب نظر آتے ہیں ۔ سوتی سلائی کا کام اور ہاتھ کی دستکاری سب بنایا گیا ہے۔ انیسویں صدی میں بودوباش اور رہائش میں نمایاں تبدیلی ہے ۔عورتوں کا لباس مغربی طرز کا ہے ۔ ترکی کے آخری سلاطین کافی مغرب زدہ ہو گئے تھے۔ مغربی طرز زندگی کا اثر ملک پر بھی پڑا اوران کے حرم پر بھی ۔ میوزیم میں اس دور اور اس سے پہلے کے زیورات بھی پڑے ہیں ۔ موتی ، پتھر ، دھات اور سونے چاندی کا استعمال کیا گیا ہے ۔ برتن مٹی اور دھات کے ہیں ۔ نادر اشیاء وہاں پڑی ہوئی ہیں ۔ اونچی دیواریں ، اونچے ایوان ، اونچے گنبد اور سنگ سفید اور سنگ گرے کا استعمال سب بہت دیدہ زیب ہے، لگتا ہے اس پرشکوہ محل کے مکین ابھی کہیں سے آجائیں گے ۔ ویرانی کے باوجود ایک عجیب طرح کی آبادی کا احساس ہوتا ہے۔ کیا واقعی جانے والوں کا دنیا والے سے رابطہ رہتا ہے؟ انکی روحیں عالم ارواح سے واپس اس فانی دنیا میں آتی ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتیں؟ یہ سوال بحث طلب ہے۔ استنبول کا ذکر ادھورا رہ جاتا ہے ۔ اگر اس پرانے بازار کا ذکر نہ کیا جائے ۔ جو سلطانوں کے محل کے پچھواڑے میں صدیوں سے دفن ہے ۔ چارسو دکانوں کا یہ بازار جو اوپر سے سارا ڈھکا ہوا ہے ۔ اپنے اندر پرانے اور جدید ترکی کی ساری نوادرات کے ساتھ سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے ۔ دکانیں پرانی بھی ہیں اور نئی بھی بن گئی ہیں ، لیکن طرز وہی ہے جو صدیوں پہلے کا تھا ۔ ساخت اور بناوٹ میں زیادہ فرق نہیں ۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں ، پتھریلی گلیاں ، جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے قہوہ خانے ، سیاحوں کا ہجوم ، میوزک کی مدھر دھنیں ، طلسماتی ماحول پیدا کرتی ہیں ۔ ترکی پرانی طرز کے

زیورات اور چمڑے کی ملبوسات کے لئے مشہور ہے ۔ سونے کے پرانے اور جدید زیورات کے ساتھ روائتی زیورات جو صدیوں پہلے اس سرزمین میں پہنے جاتے تھے موجود ہیں ۔ بڑے بڑے آویزے، کان پھول موتیوں اور پتھروں کے ہار، چوڑے اور دیدہ زیب کڑے، چاندی پر باریک گلکاری سے بنے ہوئے خوبصورت زیورات جن میں اصلی پتھر اور نگ جڑے ہوئے ہیں ۔ گاہکوں کی توجہ کا مرکز ہیں ۔ اِس بازار میں غیر ملکی ہی زیادہ نظر آتے ہیں ۔ امریکن اور یورپین لوگ خریداری میں مصروف دکانداروں کو منہ مانگی قیمتیں بھی دیتے یں ۔ تانبے کی باریک نقش نگاری اور گلکاری سے استعمال کی بے شمار چیزیں دستیاب ہیں ۔ جن میں برتنوں کے علاوہ آرائشی چیزیں بھی ہیں ۔ قالین بھی بہت قسم کے ہیں ۔ ہاتھ کے بنے ہوئے پرانی صنعت کے قالین اور مشین سے بنے ہوئے قالین بھی ملتے ہیں ۔

بازار میں ہر وقت رش ہوتا ہے ۔ پیدل سارا بازار گھومنا پڑتا ہے ۔ گاڑیاں نہیں جاسکتیں اور یہ بھی ایک روایت کے طور پر بڑا اچھا لگتا ہے ۔ دکانیں نئی بھی بن گئی ہیں لیکن بازار وہی ہے ۔ اور بعض دکانوں کی ساخت بالکل صدیوں پرانی ہے ۔ صدیوں پرانی اینٹیں لگی ہوئی ہیں جن میں وقت کے ساتھ مرمت کی گئی ہیں ۔

استنبول پرانی اور نئی تہذیبوں کا ایک خوبصورت مسکن ہے ۔ مسجدوں کا شہر، نیلگوں سمندر کا شہر، پرانے محلات کا شہر، ایشیا اور یورپ کے سنگھم کا شہر، بہر حال اسے کوئی بھی نام دیں وہ خوبصورت ہوگا ۔ بڑی سہانی یادوں میں ایک شام اس شہر سے رخصت ہوئی ۔ اُس دن سارا دن بارش پڑتی رہی ۔ ہوٹل کے کشادہ ہال سے میں باہر بھیگے موسم میں بھی لوگوں کو آتا جاتا دیکھتی رہی ۔ خوش شکل اور خوش طبیعت ترک پاکستان

سے محبت کرتے ہیں۔کسی بھی پاکستانی کو دیکھ کران کے چہرے پرخوشی کی لہر آجاتی ہے۔ اتاترک ایئر پورٹ،شہر سے کچھ دور ہے۔دنیا بھر سے پروازیں ہر وقت آتی جاتی ہیں اور ہرنسل اور ہرقوم کے لوگ نظر آتے ہیں ۔ جہاز میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس خوبصورت شہرکو الوداع کہا۔اورایک انجانی خوشی محسوس کی کہ میں واپس وطن جارہی ہوں۔اپنے ملک کی کشش بھی عجیب سی ہوتی ہے!شایداسلئے شاعروں اوراد یبوں نے ملک کو''ماں'' کاعظیم درجہ دیا ہے۔

......☆......☆......☆......

کولمبس کے ملک میں

شام کے دھندلکے میں جب جہاز نیویارک کے جان کینیڈی ایئر پورٹ کے قریب پہنچا تو دودھیا شیشوں سے بقعہ نور فضا کو دیکھ کر مجھے بے اختیار فیض کی غزل یاد آگئی۔''اے روشنیوں کے شہر'' انہوں نے تو یہ نظم اپنے ملک کیلئے لکھی تھی ،لیکن کولمبس کے ملک کے اس بین الاقوامی شہر کیلئے موزوں لگ رہی تھی۔یہ روشنیاں میلوں سے نظر آرہی تھیں ۔آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں ۔ڈبے نما ایک جیسے گھر چوڑی سڑکیں ، کاروں کی بھرماراورلوگوں کا بےتحاشہ ہجوم شام کے ملگجے سایوں میں بھی دیکھائی دے رہا تھا۔روشنی کی ضیاء پاشی سے شام کا احساس ختم ہو گیا تھا۔دنیا کے اِس امیر ترین ملک میں شاید شام آتی ہی نہیں۔شام تو پسماندہ اورغریب قوموں کا مقدر ہے۔

20 گھنٹے کے طویل ہوائی سفر سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ساری زندگی جہاز میں بیت گئی ہو۔بہرحال یہ خیال خوش کن تھا کہ منزل آ گئی ہے اور مجھے اپنے

وجود میں عجیب طرح کی خوشی کا احساس ہوا کہ وطن سے اتنی دور اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کا اس بین الاقوامی ادارے میں جسے ''اقوام متحدہ'' کی تنظیم کہا جاتا ہے۔ مجھے خدا نے موقع دیا ہے۔ پاکستان سے اور لوگ بھی اس ڈیلیگیشن میں شامل تھے۔ بعض آگئے تھے، بعض آنے والے تھے لیکن آج کی اس پرواز میں میرے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔

وزارتِ خارجہ کے لوگ مجھے لینے آئے تھے۔ ایئر پورٹ نیویارک شہر سے کافی دور ہے۔ یو این اے کے قریب ایک ہوٹل میں میرے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔ عام طور پر لوگ یہیں ٹھہرتے ہیں۔ پی آئی اے نے یہ ہوٹل خریدا تھا۔ پھر یہاں کے مقامی لوگوں کو کرائے پر دے دیا اور وہی اسکا بندوبست کرتے ہیں۔ پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ کیا ہم خود اسکا انتظام نہیں کر سکتے؟

ہمارے اتنے لوگ اس ملک میں روزگار کی تلاش میں آتے ہیں، ہوٹل کا انتظام اپنا ہوتو بہت سے لوگوں کو روزگار میسر ہوسکتا ہے۔ پی آئی اے کا سارا عملہ بھی یہیں ٹھہرتا ہے۔ جتنے روز میرا قیام تھا ہوٹل بھرا رہا، کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ حالانکہ اُنیس منزلوں کا یہ ہوٹل جس کی ہر منزل میں سو کمرے ہیں اور تہہ خانے میں بھی کمرے ہیں چھوٹا ہوٹل نہیں ہے۔

ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کا سارا راستہ میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، جدت کوئی نہیں تھی یکسانیت تھی۔ ایک سی بڑی بڑی بلڈنگیں، کئی کئی منزل، ایک سی بناوٹ اور ایک ہی طرح کا سٹائل۔ ڈیڑھ کروڑ انسانوں کے اس بڑے شہر میں جہاں دنیا کے ہر ملک، ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگ آباد ہیں انسانوں کا ایک سیلاب محسوس ہوتا ہے۔ چند دنوں کے قیام کے بعد مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ یہاں رات ہو جانے کے باوجود رات

نہیں آتی۔ ساری رات ٹریفک چلتی ہے، ساری رات اکثر دکانیں کھلی رہتی ہیں اور ساری رات لوگ کام کرتے ہیں۔ شائد اس لئے بھی کچھ زیادہ تھا۔ کہ کرسمس کی آمد تھی۔ یہ لوگ مذہب کے پابند اگرنہیں بھی ہیں لیکن کرسمس بڑی گرم جوشی سے مناتے ہیں۔ سارے سال کی آمدنی اس موقع پر خرچ کر دیتے ہیں۔ تحفے، تحائف دیتے ہیں چھٹی مناتے ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس ملنے جاتے ہیں اور تہوار سے ایک ماہ قبل ہی کرسمس کا درخت اور روشنیاں لگا دیتے ہیں۔

یو این او میں اس وقت دنیا کے **186** ممالک ممبر ہیں تقریباً اس سرزمین پر رہنے والے سارے ملک ہی اس میں شامل ہیں اور اخلاقی طور پر یو این او کے اُن تمام اصولوں کے کاربند ہیں جنکے تحت یہ ادارہ معرض وجود میں آیا۔ ان میں سب سے زیادہ دنیا میں جنگ وجدل ختم کرنا، انسانی حقوق کی حفاظت، بین الاقوامی انصاف کا تحفظ، دنیا کی ترقی کے لئے راہیں ہموار کرنا اور سارے ملکوں اور قوموں کے اچھے تعلقات بحال کرنا ، اصل مقصد ہے اور اس کے لئے یو این او کی تنظیم کو ایک ادارہ کے طور پر استعمال میں لانا غرض ہے۔

یو این او کا مسودہ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں دنیا کے پچاس ملکوں نے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں سن فرانسیکو میں **25** اپریل سے **26** جون **1945**ء میں تیار کیا تھا۔ یہ مسودہ چین، فرانس، روس، انگلینڈ اور امریکہ نے واشنگٹن میں اگست اور اکتوبر **1944**ء میں تیار کیا تھا۔ اِس کے حق میں **26** جون **1945**ء میں پچاس ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے تھے۔ اِس فیصلے کے بعد پولینڈ بھی اس میں شامل ہو گیا تھا۔ جس سے ان ممالک کی تعداد اکیاون ہوگئی تھی۔

یو این او کے معرض وجود میں آنے سے بین الاقوامی سطح پر دنیا کے ان مسائل

کا حق تلاش کیا گیا۔ جو انسانیت کے لئے باعث تشویش ہیں۔ چند سالوں میں اس کی ممبر شپ اتنی زیادہ ہوگئی کہ اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک اس ادارے کے ممبر ہیں۔ دنیا میں بے شمار مہاجرین جو جنگوں کی وجہ سے بے گھر اور بے وطن ہوگئے ہیں اس ادارے نے پناہ دی۔ اس ادارے نے **100** کڑوڑ لوگوں کو آزادی اور اپنا ملک دلوایا۔ اس نے دنیا میں امن قائم رکھنے کیلئے **26** بار مختلف ملکوں میں لڑائی بند کروائی۔ بین الاقوامی قانون کا تحفظ کیا اور **170** نئے قانون پاس کئے جس سے ملکوں کے حقوق کا تحفظ ہوا۔ اور اس طرح دنیا میں آزادی کی جنگ لڑنے والے اور آزادی سے محبت کرنے والوں کی شنوائی ہوئی۔

24 اکتوبر **1945**ء میں یو این او کا چارٹر پاس ہوا تھا اور ہر سال اس دن اس کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ **1995**ء میں یو این او نے اپنی تنظیم کے پچاس سال پورے کرلے گا۔ حیرت ہے یہ ادارہ دنیا میں امن قائم رکھنے اور انسانوں کے حقوق کی بحالی کی ایک مؤثر تنظیم ہے، لیکن کشمیر کے سلگتے ہوئے مسئلے اور وہاں انسانی حقوق کی پامالی کیلئے اس ادارے نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ کشمیر کا مسئلہ یو این او کے ایجنڈے پر گزشتہ **47** برس سے موجود ہے۔ شائد اِس میں ہماری اپنی کوتاہیاں بھی شامل ہیں۔ جس طرح گزشتہ چار یا پانچ سالوں میں کشمیر کا مسئلہ زندہ ہوا ہے۔ اور دنیا کے سامنے آیا ہے۔ اس طرح پہلے نہیں تھا۔ اپنے حقوق کی بحالی اور اس کے تحفظ کیلئے سب سے پہلے خود بھرپور کوشش کرنا چاہیے۔ عالمی ادارے تو بعد میں مدد کرتے ہیں۔ پہلے تو دوسروں کو روشناس کروانا ضروری ہے۔ یہاں ہمیں شکست ہوئی ہے۔ کیونکہ ہم نے مؤثر طریقے سے اپنی وکالت نہیں کی۔

یو این او کی پرشکوہ عمارت جس پر دنیا کے اتنے ملکوں کے جھنڈے لہراتے

ہیں۔ نیویارک کے شہر مین ہٹن کے علاقے میں تیرہ ایکڑ رقبے میں واقعہ ہے۔ اس کی تین منزلیں ہیں۔ جن میں یو این او کا سکڑیڑیٹ ہے۔ اور ایک ہزار پانچ سو لوگ یہاں دفتر میں کام کرتے ہیں۔ سیکورٹی کونسل کا ہال بہت بڑا ہے۔ اس کی گول بناوٹ میں بنی ہوئی ابڑا کشادہ چھت دور سے نظر آتی ہے۔ اس لیے اس عمارت کی بھی تین منزلیں ہیں۔ جن میں بے شمار کانفرنس روم لائبریریاں نشست گاہیں کیفے ٹیریا، ڈاکخانہ، دکانیں۔ بنک، کتابوں کی دکانیں اور اس ادارے سے مطلقہ جگہیں ہیں۔ ڈیلیگیڈ لاونج کے بڑے ہال کے شیشے والے دروازوں سے سامنے دریا ایسٹ نظر آتا ہے۔ جو اس بلڈنگ کے تین اطراف بہتا ہے۔ اوپر کیفٹیریا میں بیٹھ کر دریا میں چلتے چھوٹے جہاز اور فیری اور بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ سمندری پرندوں کے غول بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں بعض بڑے خوبصورت ہیں۔ بالکل برف کی طرح سفید اور بعض دریا کے نیلگوں پانی کی طرح ہیں۔ دریا پر پل بھی یہاں سے نظر آتا ہے۔ کچھ دور یہاں کی مڈٹاؤن ٹنل ہے۔ **Midtown Tunnel** ہے۔ جو مین ہٹن کو کوئیز سے کو ملاتی ہے۔ نیویارک شہر پانچ حصوں میں تقسیم ہے مین ہٹن، کوئینز، برک لینڈ، برانکس **(Bronx)** اور میٹن آئی لینڈ۔ **(Statter Island)** اِن جگہوں میں دو ٹنل بھی ہیں۔ ایک کا نام ہالینڈ ٹنل ہے اور دوسری کا لنکن کا مجسمہ ٹنل ہڈسن دریا اُن کے اوپر بہتا ہے اس دریا کے مغرب کی طرف روز ویلٹ آئی لینڈ ہیں ایسٹ اور ہڈسن دونوں دریاؤں میں چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے ہوئے ہیں۔

نیویارک میں ایلس جزیرہ میں بنا ہوا ہے۔ یہ مجسمہ **1898**ء میں فرانس سے امریکہ کو تحفہ میں آیا تھا بیسویں صدی کے شروع سے تقریباً **12** کڑوڑ لوگ امریکہ میں آئے تو انہیں سب سے پہلے گرین وچ گاؤں اور چائنا ٹاؤن کے بعد جزیرے میں کھڑا

اس خاتون کا یہ عظیم الشان مجسمہ نظر آتا ہے۔ جو دائیں ہاتھ میں آزادی کی شمع لئے دور سے کھڑی نظر آتی ہے۔ چاروں طرف پانی میں خشکی کے چھوٹے سے قطعے میں یہ مجسمہ ''آزادی'' کی ایک علامت ہے۔لوگ فری اور چھوٹے جہازوں میں بیٹھ کر اس خشک قطعے میں آتے ہیں اور مجسمہ کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ جہاں سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے۔دو پل ساتھ ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ نیویارک کی سب سے بڑی بلڈنگ ''ٹریڈ سنٹر'' کی سب سے آخری منزل سے یہ مجسمہ بڑا جاذب نظر لگتا تھا۔ٹریڈ سنٹر جاتے ہوئے پین ریلوے اسٹیشن آتا ہے۔ **Pen Railway Station** جو نیویارک کا سب سے پرانا ریلوے اسٹیشن ہے۔سب سے بڑا بھی ہے۔ یہاں سے امریکہ کی چالیس مختلف ریاستوں کی طرف ٹرین جاتی ہیں۔ایک طرح سے یہ لاہور کا لکشمی چوک ہے۔راستے میں وہی نیویارک کی بڑی بڑی بلڈنگیں جن میں رہائش کے ساتھ دفتر بھی ہیں۔لوگوں کا رش، گندگی کے ڈھیر بھی نظر آتے ہیں۔فقیر بھی بہت ہیں۔ مانگتے بھی ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح فٹ پاتھ کے ایک طرف ایسے لوگوں نے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں۔اور اپنی مشکلات کا تذکرہ لکھ کر گلے میں لٹکایا ہوا ہے۔

نیویارک میں بے گھر لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ بوریا بستر کے ساتھ اپنے کھانے پینے کا سامان اور برتن لے کر سڑک کے کنارے ایسے لوگ نظر آتے ہیں۔حکومت نے انکے لئے ویلفیئر سینٹر بنائے ہوئے ہیں۔لیکن وہاں جانے سے کتراتے ہیں۔ اِن لوگوں کو حکومت کی طرف سے ماہانہ کچھ رقم ملتی ہے جو ٹکٹوں کی صورت میں ہے تا کہ یہ اپنے لئے کھانے پینے کا سامان خرید سکیں۔ان میں سے اکثر پچاس ڈالر کی ٹکٹ ،بیس ڈالر میں بیچ کر نقد پیسے لے لیتے ہیں اور حکومت اس چیز کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہاں زمین دوز ٹرینیں شہر میں چلتی ہیں۔ان سے روزانہ ایک کروڑ

افراد سفر کرتے ہیں۔اگر یہ ٹرینیں نہ ہوں تو اس شہر میں زندگی ٹھہر جائے اور لوگ کام پر نہ آسکیں۔ٹرینوں کے آگے رکاوٹ نہیں ہوتی۔اس لئے جلدی سے لوگ آجا سکتے ہیں۔سڑکوں پر ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ان زمین دوز ٹرینوں کے اندر پٹریوں اور راہ گزروں پر گٹار بجانے والے مرد اور عورتیں بھی نظر آتے ہیں۔ٹرینوں کی انتظامیہ بھی انہیں پیسے دیتی ہے۔اسٹیشنوں پر کھانے پینے کے ریسٹورنٹ اور چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ہیں۔

یہیں ایک ریسٹورنٹ ’بنگلہ دیش‘ کے کسی آدمی کا تھا۔ہم نے وہاں چائے پی اور اسے جب یہ بتایا کہ بنگلہ دیش چونکہ ایک وقت میں پاکستان کا حصہ تھا۔اسلئے ہمیں ابھی بھی وہاں کے لوگ اپنے لگتے ہیں تو وہ سیاست پر خوب کھل کر بولا۔کہنے لگا صرف مغربی پاکستان کے رویے کی وجہ سے ملک الگ ہوا، اور ہمیں اس کا کوئی افسوس نہیں اس لئے کہ بنگالی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہتے ہیں۔اب ایسا نہیں کہ ہمیں اپنے کام کروانے کے لئے کراچی جانا پڑے جو بنگلہ دیش سے اتنا دور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اپنی عاقبت اندیشی اور غیر سیاسی سوچ کی وجہ سے بنگلہ دیش کو کھویا۔ ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا۔افسوس تو یہ ہے کہ جو سیاست دان ایسی غلطیاں کرتے ہیں جو ملک کے مفاد کیلئے نقصان دہ ہوں۔وہ آئندہ نسلوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کا ہم سے کٹ جانا ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔اس طرح جس ٹیکسی میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا وہ ڈرائیور بھی بنگلہ دیش کا تھا۔اس کی سوچ یہ تھی کہ مذہب صرف انسانیت کا نام ہے۔فرقے اور آپس کی رنجش جو مذہب کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ہمیں کھوکھلا کر دیتے ہیں اور ہم اپنی

انفرادیت کھو دیتے ہیں۔

ٹریڈ سنٹر کی **113** منزلیں تھیں۔ جہاں سے پچاس میل تک نیو یارک اور گردونواح کے علاقے دیکھے جاسکتے تھے۔اس سے اوپر نیو یارک ٹی وی کا انٹینا ہے۔ جہاں کے پچاسی چینل سے مختلف پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ کچھ سال پہلے نیو یارک کی ایمپائر سنٹر سب سے بڑی بلڈنگ تھی۔اس کے بعد ٹریڈ سنٹر سب سے بڑی بن گئی تھی اور اب کینڈا میں اس سے بھی بڑی بلڈنگ موجود ہے۔ بلڈنگ کی **107** منزل پر زندگی پورے جوبن پر ہے کیفٹر یا دکانیں جہاں ہر چیز دستیاب ہے۔گول طرز میں یہ بلڈنگ اتنی اونچی ہے کہ نیچے کاریں اور انسان بڑے چھوٹے لگتے ہیں۔ یہاں سے سامنے **Statue of Liberty**، جزیرے میں کھڑا جہاز بڑا قریب محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ پہلے یہاں دریا زیادہ چوڑا تھا۔

اب حکومت نے کافی حصے کو خشکی میں تبدیل کر دیا ہے جہاں گھر ہیں، دفتر ہیں ،تفریح کی جگہیں ہیں۔ نیچے دور دور تک پھیلا ہوا نیو یارک شہر اور اس کے ساتھ ملحقہ علاقے روشنیوں سے بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔

......☆......☆......☆......

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو ''آسمان کا قلعہ'' کہا جاتا ہے۔ **1454** فٹ اونچی عمارت کی **102** منزلیں ہیں۔بجلی کی تیز لفٹ کے ساتھ لوگ اوپر جاتے ہیں۔دکانیں کیفٹر یا اور دفتر اس عمارت میں واقعہ ہیں۔ اونچائی سے شہر بڑا خوبصورت اور باقی سب کچھ بڑا چھوٹا لگتا ہے۔ساری دنیا سے لوگ جب امریکہ آتے ہیں۔تو جگہ دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔خیال ہے کہ اب تک **79** کڑوڑ لوگوں نے اس بلڈنگ کو آ کر دیکھا یہاں سے اسی میل تک نیو یارک اور اردگرد کی ساری ریاستوں کو دیکھا جاتا ہے امریکہ کی ایک بہت بڑی بین الاقوامی **shreve lamb and harmoon** نے **1931**ء میں یہ بلڈنگ مکمل کی مین ہٹن کی خاص عمارت میں اس کا شمار ہوتا ہے دنیا کی اس عظیم عمارت کے بنانے میں مشرقی چونے کے پتھر کا استعمال ہوا ہے۔اور خاص قسم کا سٹین لیس سٹیل اس کی ساخت میں لگا ہے۔عمارت دن ہو یا چاندنی رات خوب چمکتی ہے۔ سٹیل اتنا عمدہ استعمال ہوا ہے کہ عمارت کی چمک قائم ہے عمارت کے اوپر سے شمال میں نیو یارک شہر پبلک لائبریری راک فیلر سنٹر، سینٹ پیٹرک کا چرچ، جارج واشنگٹن پل اور کئی

ایسی جگہیں نظر آتی ہیں۔

نیویارک میں بڑے خوبصورت چرچ ہیں۔بعض بہت پرانے ہیں بعض زیادہ پرانے نہیں لیکن پرانے چرچ میں ایک وجاہت ہے۔ایک سحر ہے۔پتھر کی موٹی موٹی دیواریں بعض پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تصویر اندر حضرت مریمؑ کی تصویریں کرائی اور مذہب کا تقدس جو ہر عبادت گاہ میں محسوس ہوتا ہے۔ایک چرچ کے اوپر **1848** کا سن لکھا ہوا ہے۔اس زمانے میں شہر یہاں گنجان نہیں ہوگا۔لیکن اب بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز اور رہائش کے بڑے بڑے ڈبے نما کئی کئی منزلہ مکانوں کے عقب میں یا پیچھے ایسے چرچ نظر آتے ہیں۔اور منفرد لگتے ہیں بعض چرچ کے نوکیلے گنبد بہت بڑے بھی ہیں۔اور اتوار کو یہاں سروس بھی ہوتی ہے۔امریکہ کی موجودہ نسل مذہب سے بہت حد تک لاتعلق ہے۔لیکن اتنا بڑا ملک ہے: پھر بھی سب لوگ مذہبی فریضے خوشی سے پورے کرتے ہیں۔نیویارک میں دو دریاؤں کے علاوہ سمندر بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے چھوٹی بڑی کشتیوں اور چھوٹے جہازوں میں لوگ پانی کی سیر کرتے ہیں دریاؤں میں چھوٹے چھوٹے جزیرے بڑے اچھے لگتے ہیں ایک علاقے کا نام گرین وچ گاؤ ں ہے۔کسی زمانے میں اس گاؤں کے ساتھ شہر کی گہما گہمی نہیں ہوگی لیکن اب ایسا نہیں لیکن گاؤں کی انفرادیت قائم ہے یہاں سے قریب ایک جگہ کو چائنہ ٹاؤن کہتے ہیں یہ بھی ماڈرن علاقہ ہے سڑک کے دونوں کنارے درخت لگے ہوئے ہیں۔کئی لوگ نیو یارک کے علاقوں میں پیدل چل کر سب دیکھتے ہیں۔لنکن سنٹر سنٹرل پارک کولمبا یونیورسٹی دریا کے ساتھ ساتھ راستہ اپالو تھیٹر۔پانچویں ایونیو کی شاندار دوکانیں اور شاندار گھر سینٹ پارک کا چرچ راک فیلر سنٹر اور دنیا کے بڑے بڑے میوزیم اس شہر میں واقع ہیں راک فیلر سنٹر میں پلازہ ہے۔ہوٹل ہیں سکیٹنگ کے لئے میدان ہیں سبزہ

اور پانی کے فوارے ہیں یہ جگہ ہر وقت پُر رونق رہتی ہے۔

بعض سیاح ہڈسن دریا میں بوٹ سے سیر کرتے ہیں پھر بس ہم ایک ایسی جگہ جاتے ہیں جو ستارھویں صدی کا ایک فارم ہاؤس ہے۔اور پرتگیز لوگوں کی ملکیت ہے وہاں جانور بھی موجود ہیں۔اور لوگ اُسی زمانے کا لباس پہنتے ہیں سر سبز گھاس کے میدان ہیں سردی کے موسم میں سبزہ زیادہ سبز ہے گرمیوں میں تو بالکل ہریالی ہوتی ہو گی۔اس جگہ امریکہ کے ایک مشہور مصنف واشنگٹن ارونگ کا گھر بھی ہڈسن کے کنارے واقعہ ہے یہ جگہیں دیکھ کر ہم **300** سال پہلے کے امریکہ میں خود کو محسوس کرتے ہیں۔

نیویارک میں کئی میوزیم ہیں۔صرف ایک میں جانے کا وقت مل سکا۔وہ سب سے بڑا ہے اور ہر چیز وہاں موجود ہے۔میٹروپالیٹن میوزیم میں زمانہ قدیم کی بے شمار چیزیں ہیں۔چار صدی قبل از مسیح کی چیزیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔پرانے ایران کے صدیوں پرانے قالین اور سلک موجود ہے۔اٹلی میں **1300** سے **1450** کے دور کے بے شمار نوادرات ہیں بڑے لوگوں کی نشست گاہوں کے صوفے قالین اور آرائش کی چیزیں ہیں۔زیورات برتن اور ضرورت کی دوسری سب ایسی چیزیں ہیں جو انسان استعمال کرتا رہا ہے۔بعض کی ساخت میں ذرا بھر تبدیلی نہیں آئی لگتا ہے کہ قدیم انسان بھی وہی چیزیں استعمال کرتا تھا۔جو اِس صدی کا انسان استعمال کرتا ہے۔

پرانے یونان کے زیورات، آرائش کی چیزیں، فرانس کی تہذیب کے نوادرات، مصوری کے شاہکار، چین کی پرانی نایاب چیزیں، ایشیاء کا پرانا آرٹ، افریقہ کی تہذیب کی بعض چیزیں۔رومہ اور دنیا اسلام کی بے شمار چیزیں جن میں ایران اور ترکی پیش پیش ہیں۔غرض مشرق اور مغرب کے سارے نوادرات یہاں جمع ہیں۔ پرانے مجسمے، بت، تصویریں، کتابیں، سکے، زیورات، برتن، فرنیچر، قالین، ملبوسات

ایک دنیا یہاں سمٹی ہوئی ہے۔ ہر وقت دیکھنے والوں کا ہجوم موجود ہے۔ خریداری کیلئے دکانیں بھی ہیں۔ اصل زیورات اور تصویروں کی نقل بکنے کیلئے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ کیفے ٹیریا موجود ہیں۔ جہاں پھولوں اور فواروں کے درمیان لوگ کھاتے پیتے ہیں۔

نیویارک پبلک لائبریری:۔

وکٹورین سٹائل کی بڑی سی بلڈنگ، سفید سنگ مرمر کی جس کے باہر دو بڑے شیر نصب ہیں۔ مین ہٹن کے آباد اور پر رونق علاقے میں واقعہ ہے۔ جس میں چار بڑے ریسرچ سنٹر ہیں۔ تقریباً **16** لاکھ کتابیں ریسرچ کے لئے طلباء کیلئے موجود ہیں۔ جس میں زیادہ تر بڑے اور پڑھے لکھے لوگوں نے خود لائبریری میں تحفتہً دی ہیں۔ ایسے ادارے اندر کام کر رہے ہیں جس میں حکومت سے زیادہ لوگوں نے پیسہ لگایا ہے۔ اور باقاعدگی سے دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ جنہوں نے اس لائبریری کیلئے عطیے دیئے اور کام کیا۔ کئی منزلوں میں یہ لائبریری بڑی بڑی راہ داریوں کے ساتھ ایک مصروف ترین جگہ ہے۔ جہاں ہزاروں طالب علم کمپیوٹر پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ سٹاف بھی کام میں مصروف ہے۔ منظّم طریقے سے یہ لائبریری ایک مکمل ادارے کی طرح کام کرتی ہے۔ اور بے شمار طلباء ریسرچ سکالر اور علم حاصل کرنے والے لوگ یہاں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ لائبریری میں داخل ہونے سے پہلے انتظامیہ نے تصویروں میں **150** سال پہلے امریکہ کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح اس براعظم میں جو اس وقت دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ لوگ گندگی، غربت، بیماری اور جہالت سے مر جاتے تھے۔ گندگی کے ڈھیر موجود رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں سے دھواں نکلتا تھا۔ جو صحت کیلئے نقصان دہ ہوتا تھا۔ گھٹے گھٹے ماحول

میں لوگ بڑے ہوتے تھے۔ اور انہیں زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہیں تھی۔ عام لوگوں کی حالت ایسی تھی، امیر تو اس وقت بھی ٹھاٹھ سے زندگی گزارتے تھے۔ یقین نہیں آتا کہ صرف اتنے تھوڑے عرصے میں اس ملک نے اتنی ترقی کر لی ہے ___ اور یہاں پسماندہ ملکوں جیسے حالات تھے۔

میوزیم میں پرانے ایران کی چیزیں بہت ہیں۔ اس بادشاہ کا نام سائرس تھا جس نے **539-580** ق م میں ایران کی پہلی بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ مقدونیہ کے شہرہ افاق بادشاہ سکندر اعظم جس نے شمالی ہندوستان کو بھی فتح کیا تھا نے ڈیریس سوئم کو **336-330** ق م میں شکست دی جس سے ایران کی پہلی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ سکندر کی موت کے بعد **323** ق م میں اس کے جرنیل سیلوکس اول نے ایران پر قبضہ کر کے اس کے ساتھ دوسرے مشرقی صوبوں میں بھی اپنی حکومت قائم کی۔ اس طرح یونان کی رسم و رواج اور زبان سارے مغرب میں پھیلی۔ آئندہ تین صدیوں میں پارتھیا حکمرانوں نے مشرق میں حکومت کی، لیکن رومیوں کے ساتھ جنگ اور باہمی نااتفاقی سے اُن کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔

نیویارک کے پاس ''لانگ آئی لینڈ'' کا علاقہ ہے جو **100** میل لمبا اور **40** میل چوڑا ہے۔ چاروں طرف چند میلوں پر سمندر ہے، اور بڑا خوبصورت ساحل ہے۔ جہاں گرمی کے موسم میں بہت رونق ہوتی ہے۔ اور دوسرے ملکوں سے بھی لوگ یہاں سیر و تفریح کیلئے آتے ہیں۔ سمندر کے ان علاقوں سے مچھلی پکڑی جاتی ہے اور تجارت کے طور پر منظّم طریقے سے دوسرے حصوں میں سپلائی ہوتی ہے۔ لانگ آئی لینڈ کا علاقہ کھلا، صاف اور نیویارک کے رش سے بہت مختلف ہے۔ کھلی سڑکیں خوبصورت پہاڑی طرز کے گھر ہیں سڑک کے ایک کنارے پر درختوں کی بھرمار لیکن

بڑے بڑے شاپنگ سنٹر اور زندگی کی بڑی سہولتیں میسر آتی ہیں رہنے کے لئے ایسی جگہ بڑی اچھی رہتی ہے جہاں سہولتوں کے ساتھ بڑے شہروں کا شور اور ہنگامہ نہیں جو ذہن پر بوجھ ڈالتا ہے واشنگٹن امریکہ کا دارلحکومت ہے: نیویارک کے بعد یہ شہر بہت کشادہ لگتا ہے لوگوں کا ہجوم کہیں نظر نہیں آتا۔ سڑکیں زیادہ چوڑی ہیں۔ ٹریفک ویسا نہیں جس طرح نیویارک میں ہے آسمان کو چھوتی ہوئی بلڈنگ اور ڈبے نما اُونچے اُونچے گھر جو سب ایک قسم کے ہیں کہیں کچھ علاقوں میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی پل اسٹیشن پر ہیں ایک ہی طرز کے چھوٹے چھوٹے مکان ستھری ستھری پھولوں کی کیاریاں باہر کھڑی کاروں کی لمبی قطاریں درختوں کے جھنڈ۔ اس موسم میں تو خزاں کی وجہ سے درختوں کی شاخیں ننگی بھی ہیں۔ اور خشک پتوں کے ڈھیر بھی ہیں: لیکن موسم گرما گرما میں یہ یقیناً بہت سرسبز ہوتے ہوں گے اور روشنی کی ایک کرن بھی یہاں نہیں جاتی ہوگی اس ملک میں گرد وغبار نہیں اور آسمان صاف نظر آتا ہے۔ سڑک کے کنارے بھی درخت ہیں جو چنار سے مشابہ ہیں چنار تو نہیں۔ لیکن پتے بالکل چنار کے پتے کی طرح ہیں سائز میں چھوٹے ہیں درخت بھی ہمارے ہاں چنار کی طرح ہیں لیکن نباتات کے ماہر ضرور بتا سکتے ہیں کہ اس درخت کا تعلق چنار سے ضرور ہے۔ واشنگٹن میں وائٹ ہارس ہے جو صدر امریکہ کی رہائش گاہ ہے اُسکے ساتھ بڑے اہم دفاتر ہیں جہاں دنیا کے دوسرے ملکوں کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ یہ بات خالی از قیاس نہیں ہے کہ امریکہ اس وقت دنیا کی ایک عظیم طاقت ہے اور اپنے اقتدار کا توازن قائم رکھنے کے لیے ایسی پالیسی وضع کرتا ہے۔ کہ دنیا کے وہ تمام ملک جو اُس کے لیے اہم ہیں اُن میں ان کا دخل ہو۔

یہاں بھی کشادہ چوڑی سڑکیں بڑے بڑے گھر اور سرکاری عمارتیں ہیں

واشنگٹن کے میوزیم میں دنیا بھر کے نوادرات موجود ہیں لنکن میموریل بھی یہاں ہیں جو امریکہ کے پہلے صدر ابراہیم لنکن کی یاد میں بنایا گیا ہے جس نے امریکہ کی آزادی کیلیئے جدوجہد کی اُنکے حقوق کی بات کی غریب والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود وہ بلندی کی شہرت پر پہنچا لیکن خود ایک قاتل کی گولی کا نشان بن گیا یہاں پرانے چرچ ہیں جو آباد ہیں۔ یہ عمارتیں زیادہ تر سفید سنگ کی بنی ہوتی ہیں جو میکیسکو سے نکالا جاتا ہے اور عمارتوں میں استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے کولمبس کے دریافت کردہ اس ملک کو دنیا کی ہر نعمت ہر موسم اور ہر چیز سے نوازا ہے اتنا کشادہ ملک اور اتنی بے شمار ریاستیں ہر طرح کا موسم بعض علاقے بہت گرم بعض بہت سرد بعض معتدل۔ پھر دنیا کے ہر حصے کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ بعض روزگار کے لئے آتے ہیں، بعض یہیں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہاں کی قدریں اپنا لیتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں دنیا کے ہر حصے سے لوگ امریکہ میں آکر آباد ہوتے ہیں۔ اب حکومت نے آنے والوں پر کچھ پابندی اور سختی عائد کردی ہے۔ ویزا لینے میں مشکلات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کے ہر ملک کے لوگ یہاں موجود ہیں، جن میں بعض اب امریکی شہری ہیں۔ اور انہیں وہی حقوق حاصل ہیں جو ایک عام امریکن کو ہیں۔ امریکہ کی اپنی انڈسٹری بھی بہت ترقی کر چکی ہے۔ باہر کے ملکوں میں امریکہ سے بے شمار چیزیں جاتی ہیں لیکن باہر کی دنیا سے بھی انکا تجارتی رشتہ قائم ہے اور دنیا کے کسی حصے کی کوئی ایسی چیز نہیں جو یہاں موجود نہ ہو۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے شہر یا حصے میں وہی سہولتیں اور مراعات ہیں جو انکے بڑے شہروں میں ہیں۔ اس لئے بعض لوگ چھوٹی جگہوں میں رہنا پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں سکون ہے۔ اور زندگی کی سہولتیں اسی طرح ہیں جس طرح بڑے شہروں میں ___ بڑے بڑے شاپنگ سینٹر جہاں دنیا کی ہر چیز دستیاب ہے۔ پھر

امریکہ میں خود اتنا کچھ تیار ہوتا ہے کہ انہیں باہر سے چیزیں منگوانے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی ہے۔ ہر شاپنگ سینٹر ایک مختصر شہر کی طرح ہے۔ بے شمار دکانیں، کیفٹریا، کھانے پینے کی جگہیں۔ نیچے اوپر جاتی ہوئی بجلی کی سیڑھیاں، پانی کے فوارے اور موسم کے پھولوں کی کیاریاں جہاں دنیا کے ہر کونے سے آئے ہوئے لوگ اپنی دنیا میں مگن نظر آتے ہیں۔ کھانا بھی ہر قسم کا ملتا ہے۔ امریکن کھانا، دیسی کھانا، یورپ، چین اور دوسرے ملکوں کا کھانا، ہمارا کھانا گوری قومیں بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ ہمارے کھانے میں اتنی لذت ہے جس کا جواب نہیں۔ مشرق کے مختلف ملکوں سے لوگوں نے امریکہ کے شہروں میں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے۔ خاندان یہاں آ کر بس گئے ہیں۔ بچے یہیں بڑے ہوتے ہیں۔ اور امریکن ماحول ہی ایسا ہے۔ ماں باپ ان اثرات کو روک نہیں سکتے اور بڑا ہو جانے پر اگر پیسہ کمانے کے بعد لوگ واپس بھی جانا چاہیں تو انکے بچوں اور خود انکا وہاں گزارہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہاں کی تیز زندگی اور روزی کمانے کی مشکلات کے باوجود وہ یہاں کے طریقے اور آرام کے عادی ہو جاتے ہیں۔

پھر خاندانوں سے دور رہ کر کئی باتوں اور ذمہ داریوں سے فرار بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جو اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد انکے موافق نہیں ہوتا۔ وہاں ایک افغانی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ تو دیکھا کہ وہاں کی آرائش بھی اپنوں نے اپنے ہی طریقے سے کی تھی۔ افغانی قالینوں کے ٹکڑے، برتن اور کھانا افغانی تھا۔ ہمارے لوگوں سے زیادہ مغربی لوگ یہ کھانا کھا رہے تھے۔ ریسٹورنٹ اور پرائیویٹ نوکریوں کے ساتھ ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی آباد ہیں۔ جو ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، پروفیسر ہیں اور دوسرے ایسے عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ ایسے خاندان ہیں جو کچھ عرصے

کے بعد وطن واپس بھی جاتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ جب ان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں تو انکے لئے مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ لڑکے بسا اوقات یہاں کی لڑکیوں سے شادیاں بھی کر لیتے ہیں۔ لڑکیوں کی شادی کا بھی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں پلی ہوئی لڑکیوں کا وہاں گزارہ نہیں ہوسکتا اور یہاں اپنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود رشتوں کی کمی ہوتی ہے۔ بعض ایسے خاندان بھی ان ملکوں میں آ کر بس گئے ہیں۔ جو پیچھے مڑ کر نہیں جاتے۔ ان کے والدین اُن کی تصویریں دیکھ کر ان کی آمد کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ خط لکھنے کی بھی انہیں فرصت نہیں ہوتی۔

......☆......☆......☆......